اشاعت کا ۹۶واں سال
زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

جولائی ۲۰۱۸ء
۱۵/روپئے

منور رانا
آصفہ زمانی، سلمیٰ حجاب
خوشبیر سنگھ شاد، امین احسن
شفیع ایوب، سنجے مصرا شوق
واسدیو موہی، چھما شرما، مصطفیٰ علی

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں کی تاریخ پیدائش (جولائی)

تلوک چند محروم

کمار پاشی

سہیل عظیم آبادی

روش صدیقی

قمر رئیس

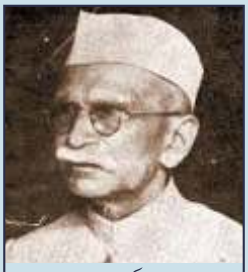
اثر لکھنوی

تنویر احمد علوی

خورشید الاسلام

عزیز وارثی

ملار موزی

راج بہادر گوڑ

شائستہ اکرام اللہ

عزیز اندوری

مسعود حسن رضوی

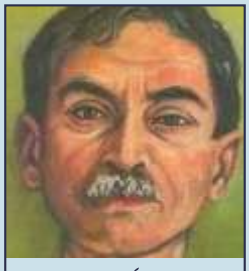
پریم چند

تلوک چند محروم	یکم جولائی ۱۸۸۷	۶ر جنوری ۱۹۶۶
سلام مچھلی شہری	یکم جولائی ۱۹۲۱	۱۹ر نومبر ۱۹۷۳
محمد حسن	یکم جولائی ۱۹۲۶	۲۵ر اپریل ۲۰۱۰
کمار پاشی	۲ر جولائی ۱۹۳۵	۱۸ر نومبر ۱۹۹۲
سہیل عظیم آبادی	۵ر جولائی ۱۹۱۱	۲۸ر نومبر ۱۹۷۹
رمز آفاقی	۸ر جولائی ۱۹۱۴	۳۱ر مئی ۲۰۰۲
صدیق مجیبی	۸ر جولائی ۱۹۳۱	۶ر مارچ ۲۰۱۴
روش صدیقی	۱۰ر جولائی ۱۹۰۹	۲۳ر جنوری ۱۹۷۱
مصور سبزواری	۱۰ر جولائی ۱۹۲۲	۱۲ر جون ۲۰۰۲

ظہیر احمد صدیقی	۱۰ر جولائی ۱۹۲۹	
ایم حبیب خاں	۱۱ر جولائی ۱۹۳۱	۲ر مارچ ۱۹۹۸
اثر لکھنوی	۱۲ر جولائی ۱۸۸۵	۶ر جون ۱۹۶۷
نازش پرتاپ گڑھی	۱۲ر جولائی ۱۹۲۴	۱۰ر اپریل ۱۹۸۴
قمر رئیس	۱۲ر جولائی ۱۹۳۲	۲۹ر اپریل ۲۰۰۹
محمد علی تاج	۱۴ر جولائی ۱۹۲۶	۱۲ر اپریل ۱۹۷۸
خضر برنی	۱۶ر جولائی ۱۹۰۸	۲۸ر فروری ۱۹۸۹
تنویر احمد علوی	۱۶ر جولائی ۱۹۳۰	۲۰ر فروری ۲۰۱۳
ملار موزی	۱۸ر جولائی ۱۸۹۶	۱۰ر جنوری ۱۹۵۲

عزیز وارثی	۱۷ر جولائی ۱۹۲۴	۲۹ر جولائی ۱۹۸۹
اعزاز افضل	۲۰ر جولائی ۱۹۳۶	یکم جنوری ۱۹۹۷
خورشید الاسلام	۲۱ر جولائی ۱۹۱۹	۱۹ر جون ۲۰۰۶
راج بہادر گوڑ	۲۱ر جولائی ۱۹۱۸	۷ر اکتوبر ۲۰۱۱
شائستہ اکرام اللہ	۲۲ر جولائی ۱۹۱۵	۱۱ر دسمبر ۲۰۰۰
عزیز اندوری	۲۳ر جولائی ۱۹۳۲	۳۰ر اکتوبر ۲۰۱۴
مسعود حسن رضوی	۲۹ر جولائی ۱۸۹۳	۲۹ر دسمبر ۱۹۷۵
پریم چند	۳۱ر جولائی ۱۸۸۰	۸ر اکتوبر ۱۹۳۶

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۳ شمارہ : ۳

ماہنامہ **نیا دور** لکھنؤ

جولائی ۲۰۱۸ء

پبلشر: ڈاکٹر اجوّل کمار
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 228
Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون
شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ
صبا عرفی
فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش
زرِ سالانہ: ۱۶۵/روپے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اترپردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیادور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ
ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

مرزا جعفر حسین

تعلیم وتربیت اطفال
صفحہ ۳۳

منوّر رانا

آج لگتا ہے کہ سچ
بول دیا ہے میں نے
صفحہ ۵

آصفہ زمانی

بے بدل فنکار
انور جلالپوری
صفحہ ۹

سلمیٰ حجاب

'بعد از خدا' کا
تجزیاتی جائزہ
صفحہ ۱۱

خوشبیر سنگھ شاد

اب تو بس آواز
ہی آواز ہے
صفحہ ۱۳

شفیع ایوب

انور جلالپوری
ایک طرحدار شخصیت
صفحہ ۱۴

سنجے مصرا شوق

واقعی بڑے فنکار تھے
انور جلالپوری
صفحہ ۱۸

پرل ایس بک

دوسری زندگی
صفحہ ۳۹

امین احسن

زبان میر کا
غیر معمولی فنکار
صفحہ ۲۱

واسدیو موہی

لاٹری
صفحہ ۴۵

چھما شرما

اس کے سورج
چاند ستارے
صفحہ ۳۶

مصطفیٰ علی

ہاسٹل کا باتھ روم
صفحہ ۴۸

نیادور میں شائع ہونے والے تمام ترمشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔حکومت اترپردیش کا متفق ہونا بہرحال ضروری نہیں ہے۔

اردو افسانہ اور نئی نسل

بزرگ افسانہ نگار رتن سنگھ نے گزشتہ دنوں دہلی میں ایک جلسہ میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو افسانے کی جانب نئی نسل کا رجحان کم ہے۔ ان کے مطابق نئے اردو افسانہ نگار جس تعداد میں سامنے آنے چاہئے، نہیں آرہے ہیں۔ انہوں نے سوال کیا کہ 'اردو افسانہ نگاروں کی نئی نسل کہاں ہے اور کب آئے گی؟'

اس بات کا اعتراف کسے نہیں ہوگا کہ اردو ادب پر ابھی بھی شعر اور شعری تنقید کا غلبہ ہے۔ ہم نیا دور کی اپنے تقریباً سوا سال کی ادارت کا تجربہ بیان کریں تو بھی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ شعر اور شعری تنقید سے مبرا ہو کر اردو میں سوچنے سمجھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ ہم نے اسی شمارے کے اخیر کے صفحات میں اس بات کا افسوس کے ساتھ ذکر بھی کیا ہے کہ گزشتہ سوا سال میں ادارۂ نیا دور کو جو ۱۶۱/ کتابیں تبصرے کے لئے موصول ہوئیں، ان میں افسانوی مجموعے اور ناول ملا کر کل ۱۷/ کتابیں ہی آئیں جن میں بعض معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔

ایک عجیب سا مفروضہ چھوڑ دیا گیا ہے اردو والوں کے درمیان کہ شاعری دوسری تمام اصناف میں سب سے برتر ہے۔ فنی اور فکری اعتبار سے بھی اور مقبولیت کے معاملے میں بھی شاعری آگے ہے، لیکن دراصل ایسا قطعی نہیں ہے۔ اردو شاعری کو جب سے مشاہیر گلوکاروں کا ساتھ ملا، غزلوں کا بازار گرم ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے فلموں اور ٹی وی سیریلس کے پردے پر غزل چھا گئی۔ انٹرنیٹ کے آنے کے بعد غزل اور نظم کے ذریعہ اردو نے غیر اردو داں طبقہ میں اپنی آمد ہی نہیں درج کرائی بلکہ ان سب کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا جن کا اردو سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، ہندوستان اور بالخصوص شمالی ہندوستان کی حد تک یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن ذرا باہر نکل کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ شیکسپیئر سے لے کر میکسم گورکی اور وہاں سے گبرئیل گارسیا مارکیز تک اور ہندوستان کی بات کریں تو دور حاضر میں اروندھتی رائے، وکرم سیٹھ اور جھمپا لاہری تک جنہوں نے بھی قلم کے ذریعہ Celebrity کا درجہ حاصل کیا ہے ان میں اکثریت شعراء کی نہیں ہے۔ یعنی عالمی پیمانے پر نظم نہیں بلکہ نثر کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اردو داں طبقہ کی شعریت کے تئیں عقیدت کی حد تک محبت انہیں خاصہ نقصان بھی پہنچاتی رہی ہے کہ اردو میں عالمی معیار کی شاعری شاید نہیں ہوئی اور اگر ہوئی ہے تو اسے بین الاقوامی سطح پر قبولیت حاصل نہیں ہو پائی، ایسا نہیں ہے کہ غالبؔ سے لے کر فیض احمد فیضؔ تک کے شعری ادب کے تراجم کو عالمی سطح پر جانچا پرکھا نہیں گیا۔ حالانکہ ہمارے درمیان مشتاق احمد یوسفی جیسے خلاق نثر نگار موجود تھے جن کے مزاح کو دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کے نقادوں کی ستائش حاصل ہوئی۔ مختار مسعود کی نثر کی تعریف نہ کی جائے، یہ کیسے ممکن ہے۔ الطاف حسین حالی سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی، رجب علی بیگ سرور، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور نیر مسعود وغیرہ جیسے کتنے ادیب ہوئے ہیں جن کو عالمی ادب کے معیار پر پرکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان میں سے بھی چند کو ہی عالمی شہرت نصیب ہوئی۔

رتن سنگھ صاحب اگر یہ شکایت کر رہے ہیں کہ نئی نسل کے افسانہ نگار کہاں ہیں، اس پر غور کرنا اشد ضروری ہے کہ کیا واقعی نئی نسل اردو افسانے سے نابلد ہے اور اگر ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اردو اداروں اور تعلیمی اداروں جہاں تنقید کو اکثر بے جا اہمیت دی جاتی ہے، انہیں اس جانب ضرور متوجہ ہونا چاہئے کہ تخلیق ہی اصل ادب ہے اور نظم کے مقابلے نثر کو کمتر محسوس کرنا اچھی علامت نہیں ہے۔ بات مشتاق احمد یوسفی کی نکلی تو دل بیٹھ گیا کہ یوسفی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے اور 'عہد یوسفی' کا خاتمہ ہو گیا۔ ہمیں اس بات کا فخر تھا کہ ہم 'عہد یوسفی' میں جی رہے ہیں۔ اداسی اور ڈپریشن کے دوران ان کے مزاح نے ہمیں ہزاروں مرتبہ زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔ ان کی تحریروں نے ہمیں اور ہم جیسے لاکھوں لوگوں کو ہنساتے ہنساتے رلا دیا اور زندگی کے ان ابواب سے روشناس کرایا جو ہم یا ہمارے جیسے لوگوں کے تصور میں بھی نہیں تھے۔ ادارہ نیا دور ان کی رحلت پر تعزیت پیش کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے انتقال کو ابھی کچھ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمیں گوپال داس نیرج نے بھی الوداع کہہ دیا۔ گنگا جمنی تہذیب کے صف اول کے علمبردار نیرج اردو اور ہندی کے بہترین نغمہ نگار تھے۔ فلموں میں ان کے بے شمار ایسے گانے مقبول ہوئے جن کی زبان صرف اور صرف اردو تھی۔ انہوں نے بارہا اس بات کا اقرار بھی کیا کہ اگر انہیں اردو نہ آتی ہوتی تو شاید وہ مقبولیت کی بلندیوں تک نہ پہنچ پاتے۔ اس شمارے میں انور جلالپوری پر ایک گوشہ شائع کیا جا رہا ہے۔ انور جلالپوری مشاعروں کے مشہور شاعر تو تھے ہی، ناظم مشاعرہ کے طور پر بھی ان کی مقبولیت کم نہ تھی لیکن مشاعروں میں شرکت اور شہرت کی وجہ سے ان کے علمی اور ادبی کاموں پر نگاہ کم ہی جا پاتی تھی۔ گزشتہ برس جب 'اردو شاعری میں گیتا' (بھگوت گیتا کے منظوم اردو ترجمہ) کا اجراء ہوا تو اس جانب توجہ گئی۔ انہوں نے گیتا ہی نہیں، گیتا نجلی کا بھی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حمد و نعت کے علاوہ نثر بھی لکھی۔ وہ بھی ہماری گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ شخصیت تھے۔

ہندوستانی ادب میں لیجنڈ کی حیثیت رکھنے والے اردو طنز و مزاح کے شہنشاہ مجتبیٰ حسین پر 'نیا دور' جلد ہی ایک شمارہ شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی طرحدار شخصیت اور تہہ دار تحریروں پر مضامین درکار ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ 'نیا دور' اپنے تمام سابقہ شماروں کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے ستمبر ۲۰۱۸ء میں مجتبیٰ حسین نمبر بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہم نے اعلان کیا تھا کہ جولائی کے شمارے میں پروفیسر مشیر الحسن کا مقالہ 'اردو زبان کی سیکولر روایت' شائع کیا جائے گا لیکن افسوس کہ اسے ہم حاصل نہ کر سکے۔ غالباً ۲۰۰۲ء میں دہلی یونیورسٹی کے نظام لکچر میں پروفیسر مشیر الحسن نے یہ مقالہ پڑھا تھا۔ ہم خود وہاں موجود تھے لیکن دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

نیا دور کے سرورق کے اندرونی حصہ پر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت و وفات سے متعلق شائع ہونے والا جدول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کلینڈر سے ماخوذ ہے لہٰذا تاریخی اغلاط کے لئے 'نیا دور' کسی طرح کا ذمہ دار نہیں ہے۔ قارئین 'نیا دور' کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا جون ۲۰۱۸ء

www.information.up.nic.in

پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

نیا دور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کئے جا رہے ہیں۔

جون ۲۰۱۸ء سے 'نیا دور' کی قیمت ۱۵/ روپے فی شمارہ کے جزوی اضافے کے ساتھ زرِ سالانہ ۱۶۵/ روپے معین کیا گیا ہے

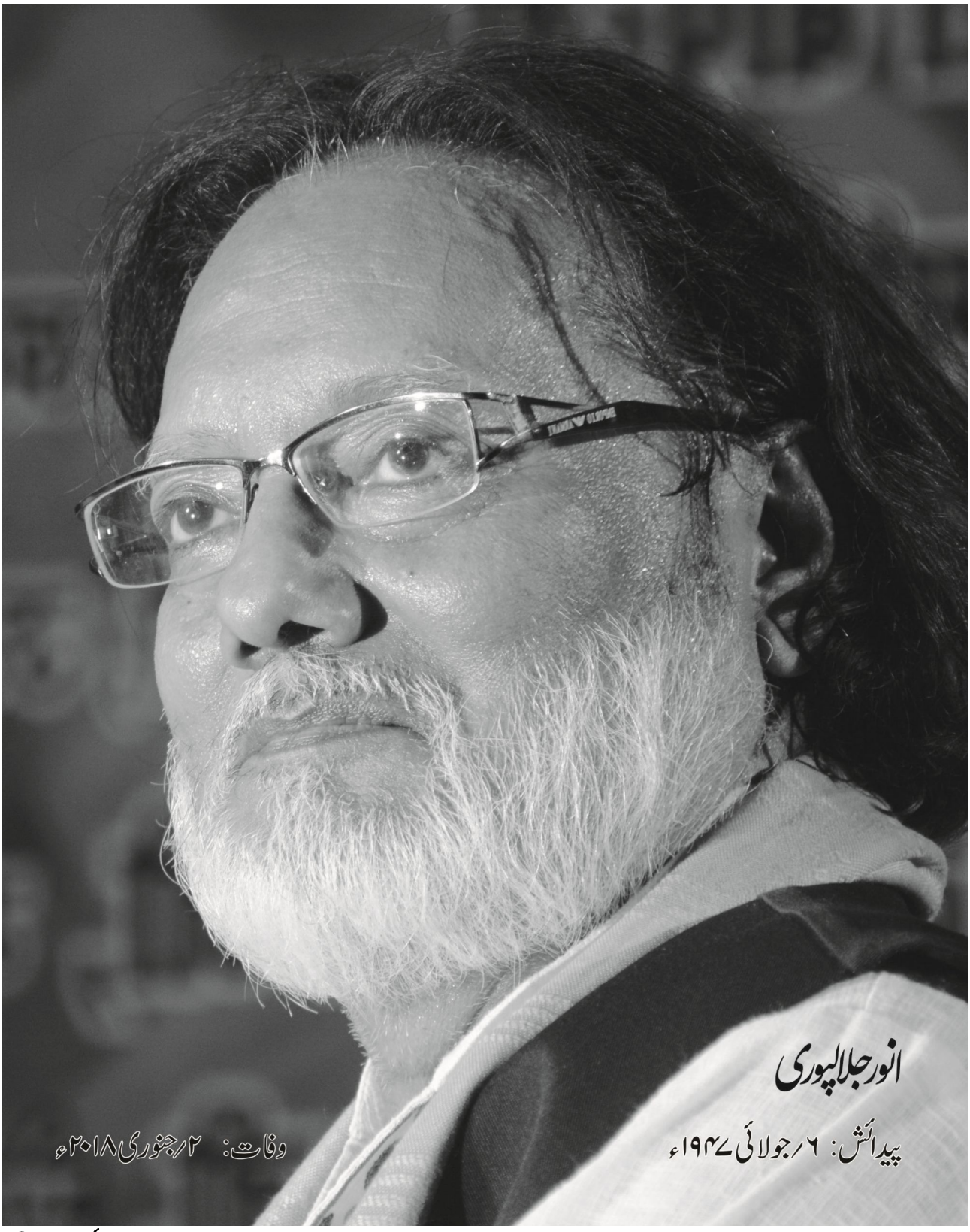
انور جلالپوری
پیدائش: ۶ر جولائی ۱۹۴۷ء
وفات: ۲ر جنوری ۲۰۱۸ء

انور جلالپوری

غزل

زلف کو ابر کا ٹکڑا نہیں لکھا میں نے
آج تک کوئی قصیدہ نہیں لکھا میں نے

جب مخاطب کیا قاتل کو تو قاتل لکھا
لکھنوی بن کے مسیحا نہیں لکھا میں نے

میں نے لکھا ہے اسے مریم و سیتا کی طرح
جسم کو اس کے اجنتا نہیں لکھا میں نے

کبھی نقاش بتایا کبھی معمار کہا
دست فنکار کو کاسہ نہیں لکھا میں نے

تو مرے پاس تھا یا تیری پرانی یادیں
کوئی اک شعر بھی تنہا نہیں لکھا میں نے

نیند ٹوٹی کہ یہ ظالم مجھے مل جاتی ہے
زندگی کو کبھی سپنا نہیں لکھا میں نے

میرا ہر شعر حقیقت کی ہے زندہ تصویر
اپنے اشعار میں قصہ نہیں لکھا میں نے

انور جلالپوری

غزل

میں ہر بے جان حرف و لفظ کو گویا بناتا ہوں
کہ اپنے فن سے بھی پتھر کو آئینہ بناتا ہوں

میں انساں ہوں مرا رشتہ براہیم اور آزر سے
کبھی مندر، کلیسا اور کبھی کعبہ بناتا ہوں

مری فطرت کسی کا بھی تعاون لے نہیں سکتی
عمارت اپنے غم خانے کی میں تنہا بناتا ہوں

نہ جانے کیوں ادھوری ہی مجھے تصویر جچتی ہے
میں کاغذ ہاتھ میں لے کر فقط چہرہ بناتا ہوں

مری خواہش کا کوئی گھر خدا معلوم کب ہوگا
ابھی تو ذہن کے پردے پہ بس نقشہ بناتا ہوں

میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں صدا اخلاق کا پارس
اسی پتھر سے مٹی چھو کے میں سونا بناتا ہوں

آج لگتا ہے کہ سچ بول دیا ہے میں نے....

منور رانا
UGF-1، ڈھینگرا اپارٹمنٹ، لال کنواں، لکھنؤ
موبائل: 9839050450

کہیں پڑھا تھا کہ کچھ لوگ دوسروں کو ہنسانے میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ ان کے اپنے ہونٹ مسکرانا بھول جاتے ہیں، کچھ ایسی ہی صورت حال انور جلالپوری کے ساتھ بھی رہی ہے۔ بھائی انور بھی ساری زندگی سادگی، شرافت اور دوست نوازی کی تلوار سے دوسروں کی حفاظت کرتے رہے، اور خود قتل ہوتے رہے۔ مشاعروں کے اسٹیج سے نجی محفلوں تک انور جلالپوری نے اپنے دوستوں ہی نہیں دشمنوں کی بھی اتنی تعریف کی ہے کہ انھیں اپنی شخصیت اور شاعری کو سنوارنے کا باقاعدہ وقت ہی نہیں مل سکا انھوں نے کسی کو بھی سلام کرنے اور تعریف کرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وہ رواداری اور بے نیازی ہے کہ ان کا ناک نقشہ فقیروں اور درویشوں سے ملتا جلتا ہے، یہی وہ خاکساری ہے، جو بندے کو خدا سے قریب کر دیتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے، جو انسان کو اشرف المخلوقات ثابت کر دیتی ہے۔

ہماری عمر کے تقریباً سبھی شعرا و ادیب اور نثر نگار انور بھائی کو اپنا دوست یا ہم عمر بتاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، انور بھائی سے میرا پہلا رشتہ سامع اور شاعر والا تھا، دیوا شریف میلے کا مشاعرہ تھا، اتفاق سے میں آیا ہوا تھا۔ ان دنوں میرا مستقل قیام کلکتہ میں تھا۔ میرے چھوٹے سالے جنھیں شاعری سے شغف بھی ہے، وہ بھی مشاعرے کے بڑے شوقین ہیں۔ ہم لوگ دیوا شریف کے میلے میں ہونے والا مشاعرہ سننے کے لئے گئے، اُن دنوں ٹی وی کے لعنت سے ہندوستان دور تھا۔ لکھنؤ سے دیوا شریف تک مجھے کار ڈرائیو کرنے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ کیونکہ لکھنؤ سے بلکہ آپ اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ دیوا شریف آنے والا ہر راستہ مشاعرہ سننے والوں کے آنے والی بھیڑ سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں سے تار بندھے ہوئے ہیں۔ سائیکل سوار بھی اپنے اپنے جتھوں کے ساتھ دیوا میلے کی طرف گامزن تھے، مشاعرہ گاہ میں بیٹھنے کی جگہ تو دور مشاعرے گاہ سے تقریباً سو فٹ پیچھے ہم اور ہمارے بھائی دو اینٹیں لے کر آئے اور ہم لوگ اسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ انور بھائی کی جوانی اور سرشاری کے عالم کا زمانہ تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ کسی شاعر کا تعارف کراتے ہوئے انور بھائی نے یہ شعر پڑھا تھا۔

اگر اے ناخدا طوفان سے لڑنے کا دم خم ہے
تو کشتی مت ادھر لانا یہاں پانی بہت کم ہے

لہجہ شگفتہ، گفتگو شاندار ادبی مذاق شائستگی کی خوبصورت شین قاف اوڑھے ہوئے یوں سمجھ لیجے کہ مشاعرہ نہیں تھا، ایک ایسی محفل یا ایک ایسی مجلس تھی جہاں ماؤں نے اپنے بچوں کو بھائیوں نے اپنے بھائیوں کو کتاب و قلم کے بغیر علم سیکھنے کے لئے بھیجا ہو، ظاہر سی بات ہے اس ہنگامے میں انور بھائی سے ملاقات بہت دشوار تھی اس مشاعرے کے بعد اگلے برس کلکتہ کے مشاعرے میں تشریف لائے وہاں ۵۶ نمبر لور چیپ پور روڈ (جو، اب راوندر ساہنی کہلاتا ہے) سی مارگ کی پہلی اور دوسری منزل پر ٹانڈا کے بہت بڑے تاجر شاعری سے بے انتہا شغف رکھنے والے رحمٰن صاحب کا قیام تھا، تقریباً روز آنا دو ٹرک لنگیاں ٹانڈا اور قرب و جوار سے کلکتہ آتی تھیں، ان کا شمار شہر کے صاحب ذوق رئیسوں میں ہوتا تھا۔ شاعروں ادیبوں کی دعوت کرنا ان کی مدد کرنا ان کے ساتھ وقت گزارنا رحمٰن صاحب کا ادبی مشغلہ تھا۔ ۵۶ نمبر عمارت بھی کئی تاریخی پہلوؤں کو چھپائے عمارتوں کی قطار میں کھڑی رہتی ہے، مشہور طوائف گوہر جان اسی عمارت میں قیام کرتی تھیں، اسی لئے اس کو گوہر بلڈنگ کہتے ہیں یہ وہی مشہور زمانہ رقاصہ گوہر جان تھیں جنکے سلسلے میں ان کی فرمائش پر اکبرالہ آبادی نے ایک شعر کہا تھا۔

دنیا میں کہاں ہے کوئی گوہر کے سوا
سب کچھ جسے حاصل ہے شوہر کے سوا

دو تین ملاقاتوں کے بعد انور بھائی سے میری دوستی ہوگئی حالانکہ صلاحیت، علم اور تجربے کے لحاظ سے انور جلال پوری کو اس دور کا بڑا شاعر یا دولت مند سیاست داں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہوا ایسا کچھ بھی نہیں۔ انور بھائی کی سیاسی گفتگو کی کترنوں سے فیضیاب ہو کر کئی موجودہ سیاستداں ایوان حکومت کے راج سنگھاسن پر براجمان ہو گئے ان کی پر مغز اور معنی خیز تعریفوں کی بدولت کئی پتھر دل شاعروں نے دیوتاؤں کا روپ دھار لیا اور انور جلالپوری اس سنگ تراش کی طرح اپنے زخمی ہاتھوں کو دیکھتے ہی رہ گئے جس کی چھینی اور ہتھوڑی کی مسلسل ضربوں نے پتھر کے جگر کو چیر کر دیوتاؤں

کے وجود کو یقین کی دولت بخشی۔ آج بھائی انور اس کوزہ گر کی طرح اپنے ہاتھوں میں لگی مٹی کو چوم رہے ہیں۔ جس نے ہنر کوزہ گری کو نور بخشتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ میلے کر لئے۔ بھائی انور نے جس پڑھے لکھے شاعر کی تعریف کی ، اسی نے انھیں نقیب مشاعرہ اور مشاعرے کا شاعر کہہ کر ان کے قد کو گھٹانے کی کوشش کی۔ جن شعرا کو ذرے سے آفتاب بنانے میں بھائی انور لہولہان ہو گئے انھوں نے بھی ان کو ایک سرائے یا زیادہ سے زیادہ مغل سرائے سمجھ کر چھوڑ دیا۔ حالانکہ بھائی انور کی شخصیت سرائے نہیں، بلکہ حویلی جیسی ہے، ایک ایسی پرسکون حویلی جہاں میٹھے پانی کا کنواں بھی ہے اور ٹھنڈے دالانوں والے کمرے بھی، کمرے میں روشن چراغ بھی ہیں، جن کی روشنی میں اردو کبھی اپنے گیسو سنوارتی ہے، کبھی اپنے اداس چہرے پر مسکراہٹ کی نقاب ڈالتی ہے۔ یہ حویلی جیسی پرسکون شخصیت اپنے اسلاف کے تہذیبی سرمائے کی حفاظت بھی کرتی ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے غزل کی ایک ایسی درسگاہ بھی تیار کرتی ہے، جہاں بیٹھ کر نئی نسل علم و ادب کی دولت سے مالامال بھی ہو اور اپنے بزرگوں کے ادبی کارناموں کو یاد کر کے ماتم نہ کرے، بلکہ جشن منائے۔

انور بھائی نے شہرت اسی عمر میں پائی جس میں شہرت ملنی چاہئے ورنہ حضرت خمار بارہ بنکوی کی طرح امریکہ جا کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ''میں صحیح جگہ پر غلط عمر میں آیا ہوں'' دراصل زیادہ دیر سے ملی شہرت بڑھاپے میں ملی اولاد کی طرح ہوتی ہے، اپنی شہرت سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا ہو، لیکن ان کے کھیلتے اور مچلتے ہوئے شباب کو کافی سہولتیں میسر رہیں۔ گول چہرہ اترتی ہوئی شام جیسا رنگ، جسے، شیام رنگ، بھی کہا جاتا ہے ،ستواں ناک ،نشیلی مگر سوچتی ہوئی آنکھیں، آنکھوں کی خواہشات پر پڑا ہوا کالے فریم کا ایک موٹا سا چشمے کا پردہ ، کبھی سلک اور کبھی کھادی کا کرتا پاجامہ ، کبھی نہرو کٹ کھادی کی واسکٹ، کبھی ڈگا مارکٹ ریشمی گاؤن کبھی کبھار ہاتھ کا ڈھیلا ڈھالا کتھی یا پھر مہندی کی پتیوں جیسے رنگ کا سوئیٹر،

سوئیٹر بننا کیوں چھوڑا
جانم کو معلوم نہیں ہے
کتنوں نے فرمائش بھی کی
اون کے گولے دوڑ کے آتے
تیلی کانوں میں کچھ کہتی
تعریفوں کی رشوت پاکر
تھوڑی سی بھی چاہت پاکر
اکثر کوشش کرنے بیٹھی
لیکن جب بھی اون کے گولے
چھو لیتے ہیں تیلی کو
مجھ کو تمہارے سارے پھندے
رہ رہ کر یاد آنے لگتے

لیکن جذبات اور موسم سرد ہونے سے پہلے انور بھائی نے ادبی شال اوڑھنا شروع کر دیا۔ انور بھائی کی شہرت کا چھوٹے سے قصبے جلال پور کی بین الاقوامی شہرت کا سبب بن گیا، اب تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ جلال پور کا نام آئے اور انور بھائی یاد نہ آئیں یا بھائی انور یاد آئیں، اور جلال پور کی یادوں کے چراغ نہ جھلملانے لگیں۔ جلال پور کے ایک ننھے سے شہر نے حفاظت اور ناز برداری کرنے والی مٹی سے سونے کا زیور بنا کر عزیز اردو سلمٰی بنت ہندوستان کے گلے میں ڈال دیا۔ انور بھائی سے میری قربت ہوئی تو 100 رکلو میٹر کا فاصلہ کم ہو کر ایک میز پر رکھے دو گلاس میں جتنا رہ گیا۔ انور بھائی بنت عنب کے شیدائی، میں اپنے زخموں کا لہو چاٹنے کا عادی، پھر بھی میرے فلسفے کے لحاظ سے جو چیز دوستوں کو اچھی لگ گئی، اسے میں نے اپنے اوپر حرام کر لیا، میز پر رکھے گلاس کا فاصلہ آج تک کم نہیں ہو سکا ، دوستوں کو انگور کی بیٹی سے کیا دوستی کرنا میں تو ہمیشہ انگور کو دوست رکھتا ہوں اصول بھی آخر کوئی چیز ہے۔

انور بھائی عمر میں تقریباً پانچ، چھ برس مجھ سے بڑے تھے۔ لیکن بہت سلجھے ہوئے معاملہ فہم اور دوراندیش آدمی تھے، اس لئے ان کی دوستی سے مجھے ہمیشہ فائدہ پہونچا کہانی کو مختصر کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ آج انور بھائی کے بچے جس کسی بھی مقام پر ہوں ان کے مستقبل کے لئے انور بھائی نے اپنی زندگی فضول خرچی کے ساتھ گزاری غالباً ۸۰ رکی دہائی میں ایک مشاعرہ باندہ میں تھا انور بھائی نے مجھے فون کیا اور مجھ سے پروگرام پوچھا میں نے انھیں بتایا کہ میں اس تاریخ کو اپنے گھر رائے بریلی میں رہوں گا، اور وہاں سے میں مشاعرے کے لئے نکلوں گا، میرے ساتھ استاد والی آسی بھائی بھی ہوں گے۔ انور بھائی نے ہنستے ہوئے کہا کہ یار اپنی کار میں ایک سیٹ میرے لئے بھی بک کرلو یوں بھی بہت دنوں سے انور چچا (میرے والد) سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔

غرض کہ ہم لوگ وہاں سے شام کو باندہ کے لئے نکلے اور تقریباً مشاعرے کے وقت باندہ پہنچ گئے، جسٹس قدوسی اسی مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے، مشاعرہ اپنی ترنگ میں پہاڑی جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا، سامعین چھچھلے تالاب کی طرح اتھل پتھل ہو رہے تھے، ہر شاعر باندہ کے باذوق سامعین کی طرف سے داد و تحسین سے نوازا جا رہا تھا۔ یوں بھی باندہ کے سامعین کا کیا کہنا ایک طرف تو وہ بیہڑ کا علاقہ بھی کہلاتا ہے، جہاں بڑے بڑے ڈاکو پیدا ہوئے، جس علاقے کے نواب یعنی باندہ کے نواب کو مرزا غالب کی میزبانی کا کئی بار موقع ملا، دریا بہاؤ پر تھا مرزا کی کشتی باندہ کے ساحل تک نہیں آسکتی تھی، تو انھوں نے وہاں راتوں رات مرزا غالب کے ٹھہرنے کے لئے ایک سرائے بنوادی تھی ایسے ادب نواز شہر کے لوگ عروس غزل کو نوازتے وقت بخل سے کیسے کام لے سکتے ہیں۔ مشاعرہ ختم ہوا والی بھائی جسٹس قدوسی کے ساتھ ان کی کار پر بیٹھ کر لکھنؤ چلے گئے۔ کیونکہ مجھے اپنے

کاروباری سلسلے میں باندہ سے الہ آباد جانا تھا، انور بھائی نے نظامت کی گٹھری باندھتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ یار تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا کہ انور بھائی مجھے تو الہ آباد جانا ہے۔ میں نے کہا کہ آیئے میرے ساتھ چلئے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے وہ موت سے بہت ڈرتے تھے، ایک تو میں بھی رات بھر کا جاگا ہوا اور تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کی ڈرائیونگ اس میں گاڑی کبھی کبھی رف بھی چلانی پڑ رہی تھی۔ انور بھائی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ارے، ارے اللہ رحم کرے آپ بڑی خطرناک ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ یوں بھی منور بھائی جب میں آپ کے ساتھ سفر کرتا ہوں تو یوں بھی میں اپنی آنکھ بند کر لیتا ہوں، میں نے اُن سے مسکراتے ہوئے کہا کہ انور بھائی گنہگار آدمی موت سے بہت ڈرتا ہے، وہ جھنجھلا کے کہتے کہ فلسفہ مت بگھارو آگے دیکھو، الہ آباد آ گیا نیند مجھ مات دینے پر پوری طرح تیار تھی ظاہر ہے کہ انور بھائی کا بھی یہی حال ہوگا۔ لیکن بقول حضرت والی آسی۔

صرف بچوں کی محبت میں یہ رسوائی ہوئی
ورنہ ساحل پر بناتے ریت کا گھر اور ہم

میں نے انور بھائی سے کہا کہ چلئے ہوٹل میں چل کر سویئے اب آپ اس حالت میں نہیں کہ اب مزید سفر کر سکیں، وہ کہیں کھو، سکے گئے، پھر کہنے لگے نہیں، منور بھائی کالج میں ناغہ ہونے سے تنخواہ بھی کٹتی ہے اور رپورٹ بھی میلی ہوگی۔ آپ ایسا کیجئے کہ آپ اپنے ڈرائیور سے کہیے کہ بس اڈے لے جا کر مجھے جلالپور کی بس پر بٹھا دے میرا جی نہیں مانا اور میں نے انور بھائی سے کہا میں خود بس اڈے تک چلتا ہوں راستے میں کھوئے کھوئے لہجے میں کہنے لگے کہ منور بھائی اپنے چاروں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے شوق میں زندگی کو اوورٹائم میں خرچ کر رہا ہوں۔ نزہت علی گڑھ میں ہے شہریار، گڈو اور جانثار یہی ہیں۔ ایک انگریزی کے لکچرر کی جو تنخواہ پرائیوٹ اسکولوں میں ہوتی ہے اتنے بڑے اخراجات کا بوجھ، اٹھانے کے لئے نہیں ہوتی، ان دنوں مشاعروں میں بھی دو ڈھائی ہزار کا پیمنٹ ہوتا تھا، ظاہر ہے معمولی تنخواہ اور مشاعرے کے معمولی پروں سے اپنے بچوں کو بہت اونچا نہیں اڑایا جا سکتا۔

تقریباً بیس برس سے اسٹیج اور نجی زندگی میں بھائی انور میرے دوست اور بڑے بھائی رہے۔ بلکہ بڑے بھائی کا حق بھی ادا کیا، یعنی اس رشتے کو پوری تہذیبی معنویت سے بھی سرفراز کیا۔ پچھلے چار پانچ برسوں نے غالباً ہم دونوں کو بہت تھکا ڈالا، کچھ گھریلو الجھنیں۔ کچھ روزگار زمانہ اور سب سے بڑھ کر مختلف بیماریوں کے سانپوں نے ہم دونوں کو خوب ڈسا، ہم دونوں تھک بھی گئے اور کچھ ٹوٹ بھی گئے۔ یہ ایسی ٹوٹ پھوٹ تھی۔ جسے سائنس کی جدید ترین مشینیں بھی محسوس نہیں کر سکتیں۔ مشاعروں میں گزری ہوئی راتوں نے جسم کو تھکن دے کر آنکھوں سے نیندیں چھین لیں، اور بھائی نے بھی شب بیداری کے کفارے کے طور پر مشاعروں میں جانا کم کر دیا۔ انھوں نے کچھ دنوں تک غم غلط کرنے کے لئے ٹی وی سیریل کے اسکرین پلے اور ڈائیلاگ لکھے، لیکن ماضی کی تھکن حال کی چستی کو کھا جاتی ہے، اس شوق نے انھیں گھر سے پھر دور کر دیا۔ جلالپور کی صدائیں، مالی پور اسٹیشن کے پلیٹ فارم کا انتظار بچوں کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں اور بھابی صاحبہ کے الجھے ہوئے گیسو، سب کے سب انور جلالپوری کو ڈھونڈ رہے تھے۔ کہاں کنارِ اودھ کی شامیں اور جگنوؤں کی روشنی کہاں راجستھان کی جلتی ہوئی ریت پر انگلیوں سے مغلیہ سلطنت کی بوسیدہ تاریخ لکھنا؟ انور بھائی جے پور کا راج گھرانا چھوڑ کر اپنی کھپریلوں کے سائے میں لوٹ آئے۔

چاندنی میں رات بھر سارا جہاں اچھا لگا
دھوپ جب پھیلی تو اپنا ہی مکاں اچھا لگا

انور بھائی کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو ان کی صاف گوئی ہے۔ ان کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ کچھ اس طرح ہے۔ مشاعرے سے پہلے کوئی نو عمر مولوی، اور وہ بھی ایسے مولوی جن کو ہر مسلک کے لوگ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مشاعرے میں ابتدائی تقریر کے وقت لفظوں کا چبا چبا کر بولنے والا ایسا ہوشیار لیڈر، جو الیکشن کے بعد عوام کو کچا چبا جانے کی فکر میں رہتا ہے۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی انور جلالپوری جھارکھنڈ کی مورچہ کے تھکے ہارے شیوسرین جیسے۔

سفر میں بہت کم گفتگو کرتے اور کسی بوڑھے فلاسفر کی طرح آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتے ہوئے، ٹرین کی پٹریاں بدلتے وقت ایک آدھ بار کسی دنیا سے بیزار درویش کی طرح آنکھیں کھول کر کھڑکی کے باہر بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھنا، اور پھر یوں مطمئن ہو جانا جیسے جہاز کا کپتان کنارہ دیکھ کر زیر لب مسکراتا ہے۔ کھانے پینے میں کوئی خاص شوق نہیں، پاس میں اچھی کتابیں ہوئیں تو پڑھ لی۔ آس پاس میں اچھا چہرہ ہوا تو دیکھ لیا۔ دیکھتے وقت آنکھوں میں وہی حسرت جو جنت دیکھتے ہوئے گنہگار کے دل میں ہوتی ہے۔ جسے ناپسند کرتے ہیں، اسے بھی دیکھ کر نہ مرجھاتے ہیں اور نہ ہی منہ پھیر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ چائے سے بڑی دوستی، سگریٹ سے بے پناہ لگاؤ پان کا انتظار ہمیشہ محبوب کی طرح کرتے ہیں۔ کوئی اچھا شعر سنا دے تو اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر نئی غزل کہنے کے لئے زمین مانگتے ہیں۔ لیکن زمین کے لئے صرف ان لوگوں سے کہتے ہیں جنھیں زمیندار سمجھتے ہیں۔ ایرے غیرے کی تو سگریٹ بھی پینے میں سراپا لکھنوی تکلف بن جاتے ہیں۔ شعر کہنے اور عشق میں تاخیر کرنے والوں کو کسی حکیم سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر اس طرح اترتے ہیں جیسے گھر کے آنگن میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ نوجوانی میں ناظم مشاعرہ ہونے سے صلاحیتوں پر داغ بٹہ لگ جاتا ہے، جس طرح ہندوستانی پارلیمینٹ میں اسپیکر کی صلاحیت سے کوئی انکار نہیں کرتا

لیکن کسی کے دل میں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ جو شخص پارلیمنٹ ہاوس میں براجمان لگ بھگ پانچ سو بیالیس بھانت بھانت اور پرانت پرانت کے شیروں کو قابو میں رکھ سکتا ہو(جن میں اکثر آدم خود ہو چکے ہیں) وہ شخص ہندوستان کی کسی بھی وزارت یا وزارت عظمیٰ کے قلم دان کا بہتر محافظ ہوسکتا ہے۔لیکن ارباب سیاست نے اسپیکر کو اور اقتداران ادب نے ناظم مشاعرہ کو 'رنگ ماسٹر' سمجھ کر نظر انداز کر رکھا ہے۔

انور بھائی کی خداداد صلاحیت سلیقے اور ہنر نے نظامت جیسی غیر ضروری چیز کو بھی فن بنا دیا ہے، اور یہی وہ ہنر ہے، جسے حاصل کرنے والا شخص دلچسپ اور باوقار شخص بن جاتا ہے۔ مشاعروں میں باقاعدہ نظامت کرنے والوں میں انور بھائی اکیلے شخص ہیں، جو ہر شاعر کو پوری توجہ کے ساتھ سنتے ہیں ۔کلاسیکلی شاعری کے علاوہ عصری ادب کے اتار چڑھاؤ پر بھی ان کی نگاہ مرکوز رہتی ہے۔ان کا مسلک کوئی بھی ہو لیکن وہ شعر کے معاملے میں دیوبندی یا صف بندی کے قائل نہیں ہیں۔مشاعروں کو انھوں نے کبھی نوٹنکی یا میوزیکل پارٹی نہیں بننے دیا۔ آخر آخر تک وہ مشاعرہ کے ادبی وقار کو بلند رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں۔وہ اکیلے ناظم مشاعرہ ہیں، جو اس بات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں کہ مشاعرے میں موجود غیر مسلموں میں اردو زبان وادب کی رسوائی نہ ہونے پائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دیوبند شریف سے دبئی تک انور بھائی کی شخصیت کا طلسم برقرار رہا۔نظامت سے ان کی دلچسپی کم ہونے سے مشاعرہ اپنے معیار سے بہت نیچے آتا جارہا ہے، یا پھر مشاعروں کے گرتے معیار سے انھوں نے مشاعروں سے کترانا شروع کر دیا تھا۔تنقید کے اجارہ داروں کے حساب سے انھوں نے شاعری بہت اچھی نہ کی ہو۔لیکن اس کے باوجود ان کی کمزور شاعری بھی ادبی رسائل میں اکثر چھپنے والی غزلوں سے بدرجہا بہتر ہے۔

لیکن جب یار لوگ غزل سے زیادہ ترنم کی اور شاعری سے زیادہ نظامت کی تعریف کرنے لگتے ہیں تو فنکار بھی کام چلاو سرکار کا طرفدار بن جاتا ہے۔اور یہی وہ وقت ہے، جب سچا ادب کوٹھے اترتے ہوئے آدمی کے پیروں کی تھکن بن جاتا ہے۔ظاہر ہے شراب کی دکان میں شہد رکھان شہد کی مکھیوں کی شب وروز کی محنت سے

مجتبیٰ حسین

اپنی مزاحیہ تحریروں اور طنزیہ جملوں سے ذہن کے دریچوں کو وا کر دینے میں طاق مجتبیٰ حسین کو ہندوستانی طنز و مزاح کا شہنشاہ بھی کہا جاتا ہے۔اردو ہی کیا دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی ان جیسا مزاح نگار شاید کوئی دوسرا نہیں۔

ادارہ 'نیا دور' مجتبیٰ حسین سے طویل انٹرویو کے ساتھ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی ادبی عظمت پر بھرپور مواد کے ساتھ ستمبر ۲۰۱۸ء میں آپ کے روبرو ہوگا۔

سراسر مذاق کرنا ہے ۔ انور بھائی کو بھی ادب کے ٹھیکیداروں نے شراب کی دکان کھولنے کا لائسنس تو دے دیا،لیکن نیم کے شہد سے سماج اور جسم میں سیاست کے پھوڑے پھنسیوں کی اجازت نہیں دی۔یقینا یہی سبب ہے کہ ہم آج ایک بیمار سماج اور سیاسی چھوت چھات کے درمیان زندہ ہیں۔انور بھائی جیسے شریف اور بھولے بھالے لوگ ادب اور سیاست دونوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتے تھے۔لیکن کچھ تو انور بھائی کا پوربی شرمیلا پن اور کچھ اقتدران ادب کی بددیانتی دونوں نے مل کر ایک اچھے شاعر کو مشاعرے کا مداری بنا کر رکھ دیا۔

استاد بسم اللہ خاں کسی تقریب میں وقت گزاری کے لئے تاش کے پتے لے کر بیٹھ گئے اور دوستوں کو بادشاہ بیگم اور جوکر کے کرتب دکھانے لگے۔تقریب میں شریک ایک مارواڑی سیٹھ بھی بسم اللہ خاں کے پاس آکر بیٹھ گئے تھوڑی دیر تک وہ تاش کے پتوں کا کرتب دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے نہایت ملتجیانہ لہجے میں استاد بسم اللہ خاں سے اپنی صاحبزادی کی شادی میں تشریف لانے کے لئے گزارش کرنے لگے۔ استاد بسم اللہ خاں تصویر خلوص بن گئے اور سیٹھ صاحب سے یہ کہتے ہوئے تقریب میں حاضر ہونے کا وعدہ کرلیا کہ ''آپ کی بیٹی میری بھی بیٹی ہے'' آپ بےفکر رہیں۔ میں شادی کی تقریب میں ضرور شرکت کروں گا۔مقررہ تاریخ پر استاد بسم اللہ خاں سیٹھ صاحب کے گھر پر تشریف لے گئے۔ سیٹھ سراپا انتظار بنے کھڑے تھے، بڑھ کر استاد بسم اللہ خاں کو نمستے کیا، پھر ان کی شہنائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' اچھا تو آپ شہنائی بجا لیتے ہیں۔''اس دلچسپ مگر افسوسناک واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کیجئے تو اس ناقدر شناس زمانے میں انور بھائی کی شاعری استاد بسم اللہ خاں کی وہ شہنائی ہے،جس کی گونج سنتے ہی گنگا کا مقدس پانی اپنی لہروں کے اشارے سے منھ اندھیرے ہندوؤں کو اسنان کرنے کے لئے اور مسلمانوں کو باوضو ہوجانے کے لئے آواز دینے لگتا ہے اور ان کی نظامت ان تاش کے پتوں کی طرح ہے جو ہمارے ارباب ادب کی اس سخن فہمی کو نمایاں کر دیتے ہیں جسے حکمت کی زبان میں کوڑھ کہا جاتا ہے۔

❑❑❑

حمد و نعت کا بھی ممتاز نام انور جلالپوری

آصفہ زمانی
4/83، وشال کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ
رابطہ: 9621914069

شاعر اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے انور جلالپوری کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک عمدہ قلمکار بھی تھے۔ ان کی شعری و نثری تخلیقات میں دو درجن سے زائد کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ نثری تصانیف میں 'روشنائی کے سفیر'، ادبی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں مولانا آزاد، ملک زادہ منظور احمد، بشیر بدر اور راحت اندوری جیسی شخصیت کا ذکر شامل ہے۔ ان کا دوسرا نثری مجموعہ 'اپنی دھرتی اپنے لوگ' ہے جس میں ان کے وطن جلالپور کی اہم شخصیات کا تذکرہ ہی قابل مطالعہ ہے۔ انور جلالپوری نے قلم کے سفیر کے نام سے اپنی تیسری نثری کتاب ترتیب دی جس میں ہم عصر مشاہیر حضرات کے بارے میں لکھا ہے۔ ان کی چوتھی نثری کتاب بھی مضامین کا مجموعہ ہے لیکن یہ کتاب اس لئے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں غیر معروف شعراء پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ انور جلالپوری کی چوتھی نثری کتاب ہے 'سفیران ادب' اس کتاب میں شعری، ادبی و ثقافتی مضمون شامل ہیں۔

جہاں تک انور جلالپوری کی شعری تخلیقات کا تعلق ہے مجموعۂ غزلیات میں 'کھارے پانی کا سلسلہ'، 'خوشبو کی تہہ داری'، 'ادب کے اکشر' اور 'پیار کی سوغات' قابل ذکر ہیں۔ نعتیہ کلام کے مجموعات بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں ضرب لا الٰہ، بعد از خدا، حرف ابجد، جمال محمدؐ (منظوم سیرت پاک) اور 'راہرو سے رہنما تک' ہے جس میں سیرت خلفائے راشدین کا منظوم ذکر ہے جو انہیں نعت گوئی میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

مذہب کے تعلق سے ان کی نظر اور مطالعہ وسیع تھا جس کی مثال منظوم شکل میں ان کا کلام ہے۔

انور جلالپوری کی قابلیت کا اندازہ ان کے منظوم تراجم سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ منظوم ترجمہ آسان کام نہیں ہے۔ ترجمہ کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی اصل روح مجروح نہ ہو اور ترجمہ نفس مضمون ادا کر رہا ہو، کامیاب مترجم کہلانے کا وہی مستحق ہے۔ انور جلالپوری کی شخصیت میں یہ خداداد صلاحیت موجود تھی۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا ببخشد خدای بخشندہ

(یہ سعادت بزور بازو حاصل نہیں کی جاسکتی جب تک خدائے تعالیٰ کی طرف سے ودیعت نہ کی گئی ہو۔)

انور جلالپوری کے منظوم تراجم میں 'اردو شاعری میں گیتا' ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ 'اردو شاعری میں گیتا نجلی' بھی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ 'اردو شاعری میں رباعیات خیام' بھی ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے اور 'توشۂ آخرت' قرآن شریف کے تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ میں انہوں نے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن سے استفادہ کیا ہے۔ 'توشۂ آخرت' واقعی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ان کے لئے توشۂ آخرت ثابت ہوا۔ اسے انہوں نے اپنے والدین کے نام معنون کر کے ایک باکردار، نیک اور لائق اولاد کا بھی فرض ادا کیا ہے۔

میں بھی 'توشۂ آخرت' سے صرف سورۂ فاتحہ کی مثال دینا چاہوں گی۔ صرف اسی کی مثال سے قاری کو قرآنی تراجم کی اہمیت کا اندازہ ہوجائے گا۔

الحمد للہ رب العالمین

(سب تعریفیں اللہ کے واسطے ہیں جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔)

اب انور جلالپوری کے شعر میں ملاحظہ فرمائیے:

وہی رب تو سارے جہانوں کا ہے
مکانوں کا ہے لا مکانوں کا ہے

الرحمن الرحیم۔ مالك یوم الدین

(بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ مالک ہے روز جزاء کا)

شعری ترجمہ انور جلالپوری

رحیم اور رحمن بھی اس کے نام
چلائے وہی سارے جگ کا نظام
قیامت کے دن کا بھی مالک وہی
اسی کے اشارے سے دنیا سبھی

ایاك نعبد و ایاك نستعین

(اے اللہ! ہم تیری اطاعت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔)

انور جلالپوری

تری ہی عبادت سے ہے واسطہ
مدد کے لئے ہے تجھی سے دعا

اھدنا الصراط المستقیم

(دکھا ہم کو سیدھا راستہ)

انور جلالپوری

بس اب نیک انساں بنا دے ہمیں
جو ہے سیدھا رستہ دکھا دے ہمیں

صراط الذین انعمت علیھم

(اوران لوگوں کا راستہ جن پرتونے اپناانعام فرمایا)

انور جلالپوری

وہ رستہ جو انعام والوں کا ہے
ترے سچے پیغام والوں کا ہے

غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

(اور ان لوگوں کا راستہ نہ دکھا جن پر تونے غضب نازل کیااوروہ گمراہ ہوئے۔)

انور جلالپوری

ہمیشہ سے ہیں جو ذلیل اور خوار
بچالے ہمیں ان سے پروردگار

انور جلالپوری نے میرے دوسرے شعری مجموعہ 'احساس بیکراں' پر بہت پر مغز تبصرہ لکھا تھا جو میرے مجموعہ میں مع ان کی تصویر کے شامل ہے۔اس کی ابتدائی سطریں میں یہاں تحریر کررہی ہوں۔اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے اشعار کی اصل روح کو پکڑ لیا تھا۔ملاحظہ ہوان کا تبصرہ:

'مجھے نہیں معلوم کہ غموں کی کتنی شکلیں ہوتی ہیں اور محرومیاں کس کس انداز میں پرچھائیں کی طرح غمزدہ لوگوں کا پیچھا کرتی رہتی ہیں مگر اردو کی بہترین اور لاجواب قلمکار ڈاکٹر آصفہ زمانی سے مل کر اور ان کے چہرے کو غور سے پڑھ کر اور آج بھی ان کی آواز کی پرسوز تھرتھراہٹ کو محسوس کر کے مندرجہ بالا سبھی باتوں پر یقین ہوجاتا ہے۔جس خاتون نے اپنے باوقار اور خوش مزاج شوہر (سید اعزاز رضوی، ایم۔ایل۔سی۔ منتری اترپردیش) کے بے جان جسم کو خوابگاہ سے قبر تک جاتے ہوئے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا ہو اور جس ماں نے اپنی انتہائی لائق وفائق اور ہمہ جہت شخصیت رکھنے والی اور راج نیتی میں بلند مقام تک پہنچنے والی بیٹی (پروفیسر شیمہ رضوی، منتری اترپردیش، صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی) کو پی جی آئی کے آئی سی یو میں کوما کی حالت میں دیکھا ہواور اس کے جنازے کو ڈبڈبائی اور پتھرائی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔اس ماں کے غم کی انتہا کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ان غموں نے ان کی شاعری کو غم کے آنسوؤں کو ڈبو دیا، جب گھر ہی اجڑ گیا ہوتو غزل مرثیہ بن جاتی ہے۔

(احساس بیکراں،۲۰۱۶ء)

انور جلالپوری ہم سے اس قدر جلد رخصت ہو جائیں گے، کسی کے تصور میں بھی نہ تھا۔آج جب میں ان کا یہ تبصرہ کوڈ کر رہی ہوں تو مجھے ان کی غزلیں بھی مرثیہ کے ہم مرتبہ نظر آرہی ہیں کیونکہ ان میں زمانے کا درد وسوز ہے۔احساس کی گہرائی ہے۔فکر کی بلندی ہے اور ان کی اپنی بلند فکر ہے جو بلا شبہ انہیں دیگر ہم عصر شعراء سے ممیز وممتاز کرتی ہے۔بقول رئیس انصاری:

ہیں لکھنؤ میں آج بھی شاعر بہت رئیسؔ
لیکن ہماری طرح کوئی سوچتا نہیں

□□□

'نیا دور' اگست ۲۰۱۸ء کے شمارے کی ایک جھلک

اردو ادب میں اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات پر **نعمان قیصر**، فارسی ادب میں غیر مسلم شعراء کی خدمات پر **ڈاکٹر سعدیہ جعفری**، اردو شعر وادب کے فروغ میں غیر مسلم شعراء پر **ڈاکٹر اسرار الحق** اور **اردو کے غیر مسلم شعراء** کی شاعری میں اسلامی اثرات پر **رضیہ پروین** کے مضامین۔

ساتھ میں کملیشور کی ادبی خدمات پر **مشرف عالم ذوقی**، بلونت سنگھ کے فن پر **رضوان انصاری**، تصوف اور ہندوستانی روحانیت پر **ڈاکٹر نریش**، جلیاں والا باغ پر **پی پی شریواستو رندؔ کے** مضامین

رتن سنگھ، چندر بھان خیال، جینت پرمار، گلشن بریلوی، آشا پربھات، دیپک بدکی، راجیو پرکاش ساحر وشال کھلر، خوشبیر سنگھ شاد، پونم کوثر، رینو بہل، منیش شکلا، نلنی وبھا نازلی، سیا سچدیو، رام پرکاش بیخود، اوینا ش امن، رمیش پانڈے شکھر، دیپک نشاط، دیپک دانش، اوم پرکاش ندیم، سنجے مصر اشوق وغیرہ کی تخلیقات

'بعد از خدا' گوہر آبدار

سلمیٰ حجاب
3/32، وپل کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل: 9453077420

اس حقیقت کا اعتراف تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے انور جلالپوری صاحب کو ہم سے چھین لیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا جسمانی وجود تو فنا ہو گیا لیکن ان کے روحانی وجود کا عکس، فکر و شعور حرف و صدا کے آئینہ خانے میں درخشاں اور تابندہ ہے۔ ان کی آواز فضاؤں میں گونجتی رہتی ہے۔ ان کے اشعار لبوں پر رقص کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تمام ادبی کاوشیں، شعری ونثری تخلیقات ان کے موجود ہونے کے دعوے پیش کرتی رہتی ہیں۔

انور جلالپوری کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ وہ بیک وقت ایک ادیب وشاعر، ایک مقرر وخطیب، ایک منفرد ناظم مشاعرہ، ایک ماہر تعلیم اور ایک قابل معلم تھے۔ ان سب خصوصیات سے ارفع واعلیٰ وہ ایک مکمل انسان تھے۔ خلوص و محبت کے پیکر، اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مظہر، صاحب وسعت فکر ونظر کی اسی وسعت نے ان کے قلم، ان کی تحریر اور ان کی تمام نگارشات کا احاطہ کر رکھا تھا۔ ان کا قلم اسیر مذہب و ملت نہیں بلکہ اس آفاقی مذہب کا پیروکار و مبلغ تھا جسے دین انسانیت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ انور جلالپوری کی باریک بین نظریں کائنات کے بنیادی اصولوں پر تھی یعنی وہ کثرت میں وحدت کی رمز آشنا تھیں۔ یہی سبب ہے کہ اگر انہوں نے 'بعد از خدا'، 'راہرو سے رہنما تک' کی تخلیق کی تو انہوں نے بھگود گیتا کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ ربیندر ناتھ ٹیگور کی مشہور زمانہ 'گیتا نجلی' کو بھی اردو کے پیکر میں ڈھال دیا۔ قرآن کے تیسویں پارے کا ترجمہ بھی کیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں یہ کارنامے نئے نہیں، اس سے پہلے بھی گیتا اور قرآن، گیتا نجلی کے ترجمے کئے جا چکے ہیں لیکن یہاں میرا موضوع ان تخلیقات کے اول و دوم ہونے پر بحث نہیں بلکہ ان کے تخلیقی شعور کی اس آفاقیت پر مرکوز ہے جو کسی شاعر کو مذہب انسانیت کا پیروکار اور مبلغ بنا دیتا ہے۔

انور جلالپوری نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مذہبوں کا تقابلی مطالعہ وہ شروع سے کرتے رہے۔ ہندوستان کے اہم مذاہب کا عمیق مطالعہ اور ان کا تقابلی جائزہ لے کر بقول کبیر داس 'سار سار سب گہر لیا' کے مصداق صداقتوں کو خود میں جذب کر کے حقائق کا انکشاف کیا۔ حاصل شدہ علم، عرفان وآگہی کو شعری پیکروں میں ڈھال کر اپنی تخلیقات کی انفرادیت پر مہر لگا دی۔ اپنے قول وفعل میں وہ ہندوستان کی اس دیرینہ مذہبی رواداری کے پابند رہے جو ہندوستانی تہذیب کی میراث ہے۔ یہی وصف ان کی زبان میں بھی ہے یعنی انہوں نے اپنے جذبۂ صادق کے اظہار کے لئے جس زبان کا استعمال کیا وہ عام فہم اور پُراثر ہے۔ انہوں نے اپنی علمیت اور زباں دانی کا بوجھ قاری کے ذہن پر نہیں ڈالا بلکہ علم اور مذہبی فلسفہ کو اتنی آسان اور رواں زبان میں پیش کر دیا ہے کہ قاری کو لطف بھی آئے اور مفہوم تک اس کی رسائی بھی ہو سکے۔

یہ ایک مجموعی تاثر تھا جو میں نے ان تمام تخلیقات کے حوالے سے مختصراً پیش کر دیا۔ ایک مضمون میں ان کی تمام شعری تخلیقات کا تذکرہ یا جائزہ لینا دشوار بلکہ ان کے ساتھ ناانصافی بھی ہوتی لہٰذا اپنے مذکورہ بالا بیان وتاثرات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ان کے نعتیہ مجموعہ 'بعد از خدا' کا انتخاب کیا۔ نعت گوئی ایک مذہبی فریضہ ہے اور ایک مسلمان کے لئے باعث ثواب وسعادت بھی ہے۔ دور حاضر میں شاعرانہ بے راہ روی اہل سخن کا وطیرہ بنی ہوئی ہے۔ انور جلالپوری کے ہدایت یافتہ پاکباز قلم نے اپنی عمر کے کئی سال نعت نبیؐ اور مدحت رسول کے لئے وقف کر دئے۔ ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔ ان کی یہ تخلیق صحیح معنوں میں روشن ہے۔ اپنے اس نعتیہ کلام میں انور جلالپوری نے اسلامی فلسفہ اور پیغمبر اسلامؐ کے فخر انسانیت وجود کو محدود شرعی فکر میں اسیر نہ کر کے ایک آفاقی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی اور رسول مقبولؐ کو دین انسانیت اور دین کائنات کے رہبر اعظم کی حیثیت سے متعارف کروایا جو کہ غیر مسلم قاری کے لئے ایک پُراثر اور اہم دستاویز بھی ہے اور دین اسلام کے فلسفہ کی آفاقیت کو عام فہم بنانے کا ذریعہ بھی۔

زیر تبصرہ تخلیق 'بعد از خدا' کو کتاب کہنا بے ادبی ہوگی۔ اسے صرف نعتیہ مجموعہ بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ تو عشق نبی میں پروان چڑھی ہے۔ حقیقتاً انور جلالپوری کے اس شعری کارنامہ کو عبادت کا درجہ حاصل ہے کہ وہ بحر عشق رسولؐ میں ڈوب ڈوب کر ابھرے ہیں اور ہر بار ان کو ایک گوہر آبدار حاصل ہوا مگر اس سرشاری میں بھی وہ گم کردۂ حقیقت نہیں ہے۔ بلاشبہ بیانوے بند کی

یہ نظم عرفان خداوندی اور فیضان عشق رسولؐ ہے۔

اس طویل نظم، جسے شاعر نے 'جمال محمدؐ' کا عنوان دیا ہے، کو پڑھنے کے بعد اس کی چند اہم خصوصیات اور نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ الہامی آمد
۲۔ تاریخی تسلسل
۳۔ وجدان عشق رسولؐ
۴۔ کا شفانہ اندازِ بیان

اس نظم کے اشعار میں اول تا آخر آورد کی جھلک نہیں ملتی۔ محسوس ہوتا ہے کہ جذبہ صادق خود بخود شعروں میں ڈھلتا جارہا ہے۔ ذکر خدا ہو یا مدحت رسولؐ، عظمت الٰہی کا بیان ہو یا شان رسالت، لفظ کُن کے اسرار ہوں یا رمز تخلیق آدم کسی بھی مقام پر ان کا قلم رکتا نہیں۔ قبل کُن کی خلائے بیکراں ہو یا فیکون کی تخلیق دو جہاں، تخلیق آدمؑ اور تخلیق زمین و آسمان۔ یہ تمام واقعات ارض و سماء تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ وہ بھی اتنی صداقت وحلاوت کے ساتھ جیسے کوئی عالم، ایمان مفصل کی تفصیلات و ترجیحات بیان کررہا ہو یا ایمان مجمل کے اسرار کھول رہا ہو۔ حیات طیبہ کے تمام روشن پہلوؤں کا بیان کرتے وقت بھی تسلسل کہیں نہیں ٹوٹا۔ نور اول سے نور آخر تک پیدائش ہے۔ یتیمی تک، بچپن سے نوجوانی تک، غار حرا سے غارِ ثور تک، بشریت سے رسالت تک، حیات طیبہ کی ایک مکمل تصویر قاری کے ذہن میں ابھر آتی ہے۔ نظم کا ہر بند الگ الگ پہلو کو اجاگر کرتا ہے لیکن ربط و تسلسل مجروح نہیں ہونے پاتا۔

یہ طویل نظم بہ عنوان جمال محمد اور اس سے قبل مجموعہ میں شامل نعتیں اور سلام اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ انورؔ جلالپوری سرشار عشق رسول ہیں۔ وہ رسول جو محسن انسانیت ہیں۔ عشق نبیؐ کی جو شمع ان کے دل میں روشن ہے، اس میں انوار الٰہی کی تابناکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا قلم وحدانیت اور رسالت کے درمیانی پل صراط کو آسانی سے پار کرلیتا ہے۔ یہ کسی نعت گو شاعر کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ جہاں تک اس نعت کے اسلوب اور انداز بیاں کا تعلق ہے وہ بھی اسی وجدانی کیفیات سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ سلاست و فصاحت کا ایک دریا قاری کو اپنے ساتھ رواں رکھتا ہے۔ پاکیزہ لفظیات، ترکیبات وتشبیہات سے نظم کا حرف حرف منور ہے۔ نظم میں غزلوں کی غنائیت اور موسیقیت ہے کیونکہ شاعر نے ردیف اور قافیہ برتنے میں احتیاط سے کام لیا ہے یا یوں کہئے کہ ہم وزن

ردیف اور قافیہ خود بخود زیر قلم آگئے اور اشعار کو ایک صوتی آہنگ عطا کرگئے۔ الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے لگتے ہیں۔ عربی اصطلاحات سے نظم میں جان آگئی ہے جو انہوں نے سرکار دو عالم کی تعظیم وتکریم کے لئے استعمال کئے ہیں مثلاً 'اعتبار قل ہواللہ احد'، 'مشعل غار حرا'، 'اے صفات فقرہ بلغ العلیٰ کشف الدجیٰ' وغیرہ و غیرہ۔

یوں تو نظم کی ہر لائن اپنی جگہ اہم ہے اور اہم تاریخی حقائق کی مظہر ہے لیکن مسدس کے آخری دو مصرعے خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں مثال کے طور پر:

دیر کی صورت تھا کعبہ کر دیا تونے حرم
سنتی تھیں حوا اسے آدم جسے کہتے رہے
یا پھر
روح کو اندر سے خواہش تھی کسی الہام کی

در اصل آخری دو مصروں میں ہمیں اسلامی فلسفہ وفکر کی نہ صرف جھلک بلکہ ترجیحات اور تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ تخلیق آدم کی عظمت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

عرش اعظم اس طرح آدم کا پہلا گھر ہوا
جلوۂ معبود اس کی آنکھ کا منظر ہوا

زمین پر انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ نے وقتاً فوقتاً جو پیغمبر مبعوث فرمائے اور جو صحیفے نازل کئے وہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ عالم انسانیت کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس تفصیل کا بیان دو مصرعوں میں ملاحظہ ہو:

امتوں نے ان سے پایا ایک دستورِ حیات
ان پہ جو اتریں کتابیں وہ ہیں منشور حیات

تاریخ عالم میں ہجرت مدینہ کا واقعہ ایک انتہائی اہم موڑ اور انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء کی بنیاد فراہم کرتا ہے جسے انورؔ جلالپوری نے بڑی مہارت سے ذیل کے دو مصرعوں میں بیان کردیا۔

ہاں اسی ہجرت نے کھولا انقلاب نو کا باب
مستقل ایثار سے اک قوم پیدا ہو گئی

انور جلالپوری نے دراصل جہد مسلسل، محنت و مشقت، ایثار وصبر ایمان وایقان کی علمبردار اس قوم کی تاریخ رقم کردی جو رہبر عالم بنی اور اس اسلامی مذہب و فلسفہ کی حقیقت بیان کردی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دین اسلام صرف دین مسلم نہیں بلکہ دین انسانیت ہے جس کے اصول آفاقی حیثیت کے حامل ہیں۔

❑❑❑

اب تو بس آواز ہی آواز ہے....

خوشبیر سنگھ شاد
B-9، سلور ریزیڈنسی اپارٹمنٹ، نزد وڈالا چوک، جالندھر موبائل: 9872011882

یہ ہم بے حسی کے کس دور سے گزر رہے ہیں کہ کوئی بری سے بری خبر بھی ہمیں کچھ لمحوں سے زیادہ متاثر نہیں رکھتی ہے اور ہم جلد از جلد اپنے معمول پر لوٹ آتے ہیں۔ احساس کا گرداب کہیں ہمیں بہت گہرائی تک نہ لے جائے اسی ڈر سے ساحل پر بیٹھے بیٹھے ہی ڈوبنے والوں کی موت کا سوگ منا لیتے ہیں۔ یہ آج کے اس تنگ دور کی تلخ سچائی ہے۔ ۸۰ء کی دہائی کی شروعات تھی شاید شاعری کے کیڑے نے ابھی کاٹا ہی تھا۔ اپنے ہمعصر نوجوانوں کی طرح ساحرؔ کے جادو نے مجھے بھی اپنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ رویندرالیہ کے ایک مشاعرے میں انور جلالپوری کو پہلی بار سنا۔ غزل تو یاد نہیں لیکن ایک شعر کا ایک مصرعہ آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔

'کھٹا کھٹا، میٹھا میٹھا یعنی تیرے نام کا پیڑ'

مشاعرے کے بعد انہوں نے جناب والی آسی سے پوچھا کہ والی بھائی آپ کو یہ شعر کیسا لگا؟ اس سے پہلے کہ والی صاحب کوئی جواب دیتے۔ میں بول پڑا، 'انور صاحب! بہت اچھا شعر ہے۔' موٹے سے چشمے کے پیچھے سے کاجل لگی ان بڑی بڑی آنکھوں نے جس انداز سے میری طرف دیکھا، میں گھبرا گیا۔ ان میں حیرت سے زیادہ حقارت تھی۔ شاید انہیں کسی سکھ نوجوان سے یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ وہ شعر سمجھ کر داد بھی دے سکتا ہے۔ وہ تو والی آسی جیسے معتبر شاعر کے منھ سے اس شعر کی تعریف سننا چاہتے تھے۔ گزشتہ سال لکھنؤ ایکسپریشن سوسائٹی کے مشاعرے سے پہلے میں نے گرین روم میں انہیں یہ قصہ سنایا تو ہنستے ہوئے بولے، 'یار خوشبیر! معاف کرنا۔ اس وقت تمہیں پہچان نہیں سکا۔'

۱۶ر دسمبر ۲۰۱۷ء کو شنکر شاد مشاعرے میں شرکت کی۔ مشاعرے سے پہلے DCM گروپ کے مالک مادھو صاحب کے گھر شاعروں اور کچھ دوسرے مہمانوں کے لئے پذیرائی کا اہتمام تھا۔ وہاں پہنچا تو دوسرے شاعروں کے ساتھ انور بھائی بھی موجود تھے۔ کچھ دن پہلے ہی لندن میں ان کی جوان بیٹی کی موت ہوگئی تھی۔ میں نے انور بھائی کی ایسی تصویر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ محفل کے آداب نبھاتی ہوئی ہونٹوں پر ایک رسمی سی مسکراہٹ لیکن آنکھوں میں کائی کی صورت جمی ہوئی ایک گہری اور دبیز اداسی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور دبی ہوئی آواز میں اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ ان کی آنکھوں کے کنارے پر نمی سی ابھر آئی اور اس نمی نے میری روح کو اندر تک نم کر دیا۔ میں سوچنے لگا کہ جس بیٹی کو پھولوں کی طرح اپنی بانہوں کے جھولے میں جھلایا ہوا سے ایک باپ نے کیسے اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے، خوشبیر! تم کوئی جھولا یا بیگ لائے ہو؟ میں نے حیرانی سے پوچھا، کیوں انور بھائی؟ بولے، تمہیں اپنی کتاب دینی ہے۔ پھر انہوں نے اپنی نئی کتاب 'اردو شاعری میں گیتا' نکالی اور اس پر لکھا تھا:

'میرے پسندیدہ شاعر، شریف انسان اور گنگا جمنی تہذیب کے پیارے نمائندے جناب خوشبیر سنگھ شاد کی خدمت عالی میں ایک تحفہ' میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ انور بھائی! یہ میں اپنی بیوی کو دکھاؤں گا کہ اب تو یقین ہوا کہ میں شریف انسان ہوں۔ کچھ دیر میں ٹی وی اینکر و نود دعا بھی آ گئے اور میں نے انہیں انور بھائی سے ملوایا۔ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر انہیں دکھائی اور کہا کہ یہ میری برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے بھگوت گیتا کا اردو شاعری میں منظوم ترجمہ۔ میرے پاس ایک ہی کاپی تھی اور میں نے خوشبیر کو دے دی۔ آپ اپنا کارڈ دے دیجئے میں آپ کو جاتے ہی بھیج دوں گا۔' اردو شاعری میں گیتا' کے لئے انہیں اتر پردیش سرکار کا یش بھارتی سمان ملا اور ان کی وفات کے بعد بھارت سرکار نے انہیں پدم شری کے خطاب سے نوازا۔ کاش! یہ ان کی زندگی ہی میں ہو جاتا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے بعد انور جلالپوری نے جس خوبصورت انداز میں اس ذمہ داری کو سنبھالا اس نے کسی حد تک منظور صاحب کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ اب اس کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کیسے بھرے گا، اس کا جواب تو صرف اور صرف وقت کے پاس ہے۔ زندگی لڑکھڑانے کے بعد بھی چلتی رہتی ہے۔ مشاعرے بدستور ہو رہے ہیں۔ کچھ نئے لوگ اچھی نظامت بھی کر رہے ہیں لیکن انور بھائی کی اس جادوئی اور مخملی آواز کا بدل شاید کبھی نہ مل پائے۔

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھوڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

□□□

انور جلالپوری ایک طرحدار شخصیت

شفیع ایوب
ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی موبائل: 9810027532

کسی مضبوط، مستحکم اور بلند عمارت کے لئے چار ستون بیحد اہم تصوّر کئے جاتے ہیں۔ ہندستان میں مشاعروں کی نظامت کو اگر ایک خوبصورت عمارت تصوّر کرلیں تو اِس کے چار ستونوں کے نام ہیں۔ ثقلین حیدر، عمر قریشی، ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری۔ ہندستان کے طول وعرض میں بے شمار مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ہر مشاعرے میں ایک ناظم ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کوئی نوآموز تو کبھی کوئی کہنہ مشق شاعر نظامت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ لیکن جن حضرات نے نظامت کو با قاعدہ ایک فن کا درجہ عطا کر دیا ہو ان میں سرِ فہرست یہی چار حضرات ہیں جن کا ذکر سطورِ بالا میں ہوا ہے۔ سب سے پہلے محترم ثقلین حیدر اس دنیا سے رخصت ہوئے پھر دیار فراق و مجنوں گورکھپور کی علمی و ادبی فضا کو سوگوار چھوڑ کر عمر قریشی راہی ملک عدم ہوئے۔ دو برس پہلے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بھی داغ مفارقت دے گئے۔ اور اب سال ۲۰۱۸ء کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا، احباب ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد پیش کر رہے تھے کہ شہر آرزو لکھنؤ سے ۲ جنوری ۲۰۱۸ء کو یہ جانکاہ خبر آئی کہ انور جلال پوری بھی مالک حقیقی سے جا ملے۔

انور جلال پوری کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ لیکن مشاعروں میں ان کی نظامت نے ایسی چمک پیدا کی کہ باقی صلاحیتیں اور کارگزاریاں دھندلی نظر آنے لگیں۔ فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کی طرح انور جلال پوری بھی اردو کے نہیں بلکہ انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے۔ اودھ کے علاقے میں ضلع امبیڈکر نگر میں جلال پور ایک تاریخی قصبہ ہے۔ اسی تاریخی قصبے میں ۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو حافظ محمد ہارون کے گھر ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام والدین نے انوار احمد رکھا۔ یہی انوار احمد انور جلال پوری بن کر دنیا بھر میں علم کی روشنی پھیلاتا رہا۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد گورکھپور یونیورسٹی سے گریجوایشن اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ وہ جلال پور کے این ڈی کالج میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ بعد میں انھوں نے اودھ یونیورسٹی سے اردو میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے نہ صرف انگریزی ادب کا مطالعہ کیا بلکہ اردو اور ہندی ادب کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ انھیں تینوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ انور جلال پوری ایک خوش فکر شاعر تھے۔ انھوں نے صرف مشاعروں کی ضرورت کے لئے شاعری نہیں کی بلکہ جو دل پہ گزرتی تھی اسے رقم کرتے رہے۔ ان کی بیشتر شاعری مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری کے باب میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ 'ضرب لا الٰہ' 'بعد از خدا' اور 'حرف ابجد' ان کے نعتیہ مجموعے ہیں۔ 'جمال محمدؐ' کے نام سے سیرت محمد ﷺ کو منظوم کیا۔ 'راہرو سے راہنما تک' سیرت خلفائے راشدین بھی ان کا ایک انمول تحفہ ہے۔ انھوں نے پارہ عم کا منظوم ترجمہ 'توشہ آخرت' کے نام سے کیا ہے۔ 'کھارے پانیوں کا سلسلہ' 'خوشبو کی رشتہ داری' اور دیو ناگری میں ''جاگتی آنکھیں'' کے نام سے ان کی غزلوں کا مجموعہ منظر عام پہ آیا اور پسند کیا گیا۔ انھوں نے گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق کتاب گیتا نجلی کا منظوم اردو ترجمہ کیا۔ 'اردو شاعری میں گیتا نجلی'' نام سے یہ کتاب شائع ہوئی تو عالمی سطح پر اس کی پذیرائی ہوئی۔ اور پھر بھگوت گیتا کے مفہوم کا منظوم اردو ترجمہ کر کے انور جلال پوری نے نہ صرف اپنی قادر الکلامی کا ثبوت پیش کیا بلکہ اپنے چاہنے والوں کے دائرے میں مزید وسعت پیدا کی۔ ادئے پرتاپ سنگھ، ڈاکٹر گوپال داس نیرج اور مراری باپو جیسی عظیم شخصیات نے انور جلال پوری کے فن کو تسلیم کیا اور انھیں اپنا آشیرواد دیا۔

جہاں تک انور جلال پوری کی نثر نگاری کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنی نثر سے بھی اہل علم کو متاثر کیا۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے۔ اردو میں 'روشنائی کے سفیر' اور دیوناگری میں 'اپنی دھرتی اپنے لوگ' مضامین کا مجموعہ ہے۔ انور جلال پوری کی نثر میں جادو ہے۔ یہ نثر راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کی نثر جیسی کھردری بھی نہیں ہے اور کرشن چندر کے افسانوں کی نثر جیسی رنگین بھی نہیں۔ ہاں اس نثر میں انور جلال پوری کے خلوص کی چاشنی اور اودھی کی مٹھاس ضرور ہے۔ مشہور صحافی اور ہندوستان میں وائس آف امریکا کے نمائندہ سہیل انجم ان کی نثر نگاری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''اگر کوئی مجھ سے پہلے پوچھتا کہ انور جلال پوری ایک اچھے شاعر اور ناظم مشاعرہ تھے یا ایک

اچھے نثر نگار تو میں فوراً جواب دیتا کہ وہ تو شاعر اور ناظم تھے ان کا نثر سے کیا تعلق؟ لیکن جب میں نے ان کے مضامین کے مجموعے ''روشنائی کے سفیر'' کا مطالعہ کیا تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ ایک اچھے شاعر اور ناظم مشاعرہ تھے یا ایک بہترین نثر نگار۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ جتنے اچھے شاعر و ناظم تھے اتنے ہی اچھے نثر نگار بھی تھے۔''

(سہیل انجم، انور جلال پوری اپنی نثر کے آئینے میں، اردو اسٹار نیوز ٹوڈے)

انور جلال پوری نے بہت کم عمری میں شاعری شروع کر دی تھی۔ ان کے ہم عصر شاعر و ادیب ان کی پُر گوئی کے قائل تھے۔ زبان پہ انھیں بھرپور دسترس حاصل تھی۔ وہ ایک بہترین خطیب تھے۔ کسی بھی موضوع پہ گھنٹوں تقریر کر سکتے تھے۔ ان کی خطابت میں پہاڑی ندی کی روانی تھی۔ اپنی فلسفیانہ گفتگو میں اَودھ کی شیرینی ملا کر پیش کرتے تو سامعین پر جادو کر دیتے تھے۔ عام طور پر مشاعروں کے شاعر مطالعہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ انھیں مطالعہ کی فرصت بھی نہیں ملتی کہ پاپی پیٹ ملکوں ملکوں شہروں شہروں انھیں پھراتا رہتا ہے۔ کچھ اس قدر نرگیسیت کے شکار ہو جاتے ہیں کہ انھیں میر و غالب سب حقیر نظر آتے ہیں۔ لیکن انور جلال پوری حقیقت پسند تھے۔ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی قدم زمین پر رکھتے تھے۔ وہ سراپا عاجزی و انکساری تھے۔ مطالعہ کے شوقین تھے۔ تمام مصروفیات کے باوجود پڑھنے کے لئے وقت نکالتے تھے۔ اور صرف اردو ادب نہیں پڑھتے بلکہ ہندی اور انگریزی ادب کا بھی مطالعہ خاصہ وسیع تھا۔ ٹیگور کی گیتا نجلی کو پڑھنا، سمجھنا، اپنی فکر کا حصہ بنانا اور پھر منظوم ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن اس کام کو انور جلال پوری نے نہایت مہارت سے انجام دیا۔ ایک طرف انھوں نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا تو دوسری جانب قدیم ہندوستانی تہذیب پہ بھی ان کی گہری نظر تھی۔ جس ڈھائی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ کو قرۃ العین حیدر نے شہرہ آفاق ناول ''آگ کا دریا'' میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی، اس تاریخ پہ انور جلال پوری بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ جنگ بدر، صلح حدیبیہ اور سانحہ کربلا پر نظر رکھنے والے انور جلال پوری مہابھارت کی جنگ پہ بھی نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ نہ صرف گیتا کے مفہوم کو سمجھ سکتے تھے بلکہ گیتا کے اُپدیش کی گہرائی اور معنویت سے پوری طرح واقف تھے۔ انھیں زمانہ طالب علمی سے گیتا میں دلچسپی تھی۔ انھوں نے گیتا کے حوالے سے اپنی پی ایچ ڈی کا خاکہ بھی تیار کیا تھا جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔ لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ایک بار پھر گیتا کی تعلیمات کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ انور جلال پوری نے شری مد بھگوت گیتا کے سات سو ایک شلوکوں کو کس فنی مہارت کے ساتھ ۱۷۶۱ اشعار کے قالب میں ڈھال کر اردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔

لیکن اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ انور جلال پوری کی عالمی شہرت ان کی بے مثال نظامت کی مرہونِ منت ہے۔ عہدِ میر یا عہدِ غالب میں مشاعروں کا جو بھی رنگ رہا ہو لیکن ہندوستان میں حصول آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد جب عاشقانِ اردو نے ذرا سنبھالا لیا تو مشاعروں نے زبردست عوامی مقبولیت حاصل کی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک کی آزادی کے ساتھ تقسیم وطن کا سانحہ بھی پیش آیا۔ اردو اور اہل اردو پر بھی بڑی ضرب پڑی۔ ان حالات میں اردو والوں کی نفسیات کا اندازہ کرنا آج کی نسل کے لئے آسان نہیں ہے۔ اس پُر آشوب دور میں سرحد پار سے آئے ہوئے لوگ اردو کے لئے ماحول سازگار بنانے میں پیش پیش تھے۔ ان میں جگن ناتھ آزاد، گوپال متل، دیوندر اِسر، بلراج کومل، کلدیپ نیر اور ان جیسے بے شمار اردو والے تھے۔ پھر ہر محاذ پر اردو کے لئے ماحول سازگار کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ان کوششوں میں عوامی مشاعروں کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم اردو کو میسر آیا جو دنیا کی کسی اور زبان کے پاس نہیں تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں عوامی مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، فراق گورکھپوری جیسے بڑے شاعر مشاعروں کے پلیٹ فارم سے عوام میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کرنے لگے۔ نوح ناروی، انور صابری، نخشب جارچوی، تاجور نجیب آبادی، نشور واحدی، فنا نظامی اور مشیر جھنجھانوی جیسے شاعروں نے مشاعروں کی مقبولیت میں اضافہ کیا اور مشاعروں کے وقار کو بھی قائم رکھا۔ اردو تہذیب میں پلے بڑھے سامعین ایک زمانے میں روش صدیقی کی فارسی تراکیب سے سجی شاعری کو مشاعروں میں سنتے بھی تھے اور داد و تحسین سے نوازتے بھی تھے۔

صبا کو اس گلِ رعنا سے ہم سخن پا کر
یہ سوچتا ہوں کہ موضوع گفتگو کیا ہے

یا پھر نشور واحدی کے یہ اشعار بھی مشاعروں کے پلیٹ فارم سے ہر خاص و عام تک پہنچے۔

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا
نہ کہیں ترا ٹھکانہ، نہ کہیں مرا ٹھکانہ

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

مشیر جھنجھانوی، فنا نظامی کانپوری، قمر مرادآبادی اور بیکل اتساہی جیسے شعرا نے جہاں ایک طرف شعری تقاضوں کا خیال رکھا وہیں عوامی مقبولیت کے پیش نظر بھی اشعار کہے۔ اب مشاعرے شہروں سے نکل کر قصبات اور دیہاتوں تک پھیل گئے۔ مشاعروں کا دائرہ بڑھنے لگا۔ مشاعروں میں سامعین کی تعداد بڑھنے لگی۔ مشاعرے رفتہ رفتہ ایک انڈسٹری کی شکل اختیار کرنے لگے۔ ایسے میں ناظم مشاعرہ کی ذمہ داریاں بڑھنے

لگیں۔اسی ماحول میں یہ اشعار کہے گئے۔

میں بھی کسی کی زلف سنوارے چلا گیا
کچھ ضد سی ہو گئی تھی نسیم سحر کے ساتھ
(مشیر جھنجھانوی)

بے ادب ہم سے نہ اے گردشِ دوراں ہونا
ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا
(قمر مرادآبادی)

سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا مرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتل تنہا
(بیکل اتساہی)

ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہیے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا
(فنا نظامی کانپوری)

اب اس ماحول میں نظامت نے ایک نئی شکل اختیار کی۔اب مشاعروں میں سرمایہ کاری ہونے لگی۔ گانے بجانے کا چلن بھی عام ہونے لگا۔اب شاعر کا تعارف ایک فن بن گیا۔اب مشاعرے کی کامیابی ناکامی کافی حد تک ناظم مشاعرہ کے کاندھوں پہ آ پڑی۔ یوں تو بہ حالتِ مجبوری کوئی بھی شاعر نظامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے اور دیتا بھی ہے۔منتظمین ایک فہرست ناظمِ مشاعرہ کے ہاتھوں میں پکڑا دیتے ہیں۔کبھی کبھی اس فہرست میں یہ ترتیب بھی ہوتی ہے کہ مشاعرے میں سب سے پہلے کون شاعر اپنا کلام سنائے گا اور کس شاعر کو فجر کی اذان کے وقت اپنا کلام سنانا ہے۔ناظمِ مشاعرہ یکے بعد دیگر شاعر کا نام پکارتا ہے، شاعر مائک پر آتا ہے، جس قدر چاہے کلام سناتا ہے، پھر دوسرا شاعر آتا ہے، سلسلہ چلتا رہتا ہے، سامعین جماہیاں لیتے رہتے ہیں۔مجمع منتشر ہوتا رہتا ہے۔اسٹیج پر بھی افراتفری کا عالم ہوتا ہے۔ناظمِ مشاعرہ مشینی ڈھنگ سے اپنا کام انجام دیتا رہتا ہے۔جبکہ ایک کہنہ مشق ناظمِ مشاعرہ شاعروں کے ساتھ ساتھ سامعین کو بھی باندھ کے رکھتا ہے۔وقت اور حالات کے مطابق شاعر کو زحمتِ کلام دیتا ہے۔مجمع منتشر ہو رہا ہو تو کسی خوش گلو اور خوش شکل شاعرہ کو آواز دیتا ہے اور سامعین کو بیٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔یہ سب کمالات جناب انور جلال پوری مرحوم میں موجود تھے۔وہ بلا کے ذہین، حاضر جواب، بزلہ سنج اور نباض تھے۔جلال پور کی علمی ادبی فضاؤں نے انور صاحب کی ایسی پرورش کی تھی وہ ہر محفل میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑنے میں کامیاب رہتے تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ قصر نظامت کے چار ستونوں میں تین ستون یعنی عمر قریشی، ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے دیار فراق و مجنوں گورکھپور سے رہا ہے۔گورکھپور کے آسمانِ ادب پہ جو چاند ستارے ہمیشہ جگ مگ کرتے رہے ہیں ان میں مہدی افادی، ریاض خیرآبادی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، ہندی گورکھپوری، پروفیسر محمود الٰہی ، پروفیسر احمر لاری، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر اختر بستوی، پروفیسر افغان اللہ خان، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ماسٹر احمر گورکھپوری کے ساتھ عمر قریشی، ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری کا نام بھی شامل ہے۔یہاں جن چند حضرات کا نام لیا گیا ہے وہ محض ایک مثال ہے ورنہ فہرست تو کافی طویل ہے۔اس فہرست میں بابائے اردو افسانہ منشی پریم چند کا نام بھی شامل ہوگا کہ وہ نارمل اسکول میں ٹیچر تھے۔گورکھپور سے منشی پریم چند کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔انکی بہت سی مشہور تخلیقات کا تعلق گورکھپور سے رہا ہے۔نارمل اسکول کے احاطے میں جہاں منشی پریم چند قیام پذیر تھے وہاں سے فرلانگ بھر کی دوری پہ عیدگاہ مبارک خاں شہید ہے۔آپ کو منشی پریم چند کی کہانی ''عیدگاہ'' تو یاد ہے نا؟ بہرحال ہم تو انور جلال پوری کی نظامت کا جائزہ لے رہے ہیں۔اور اس جائزے میں گورکھپور کا ذکر یوں آ جائے گا کہ انور جلال پوری نے اپنی تعلیمی زندگی کے کچھ برس گورکھپور میں گزارے تھے۔اور اسی گورکھپور نے ملک زادہ منظور احمد کی بھی پرورش کی تھی۔ جہاں بھی ملک زادہ منظور احمد کا ذکر آتا انور جلالپوری استاد محترم کہا کرتے تھے اور ملک زادہ منظور احمد نے بارہا نظامت میں عمر قریشی کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔اس طرح گورکھپور کی علمی ادبی فضاؤں نے بھی انور جلالپوری کی نظامت کو سنوارنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

نظامت کے جن چار ستونوں کی بات ابتدا میں کی ہے وہ چاروں اپنے اپنے انداز کے، اپنے اسلوب کے بادشاہ ہیں۔اپنے لہجے اور آواز سے پہچانے جاتے ہیں۔جناب ثقلین حیدر اپنی نظامت کے دوران بیشمار اشعار سناتے تھے۔ انکا حافظہ زبردست تھا۔ برمحل اشعار سے محفل میں جان ڈال دیتے تھے۔ ہزاروں اشعار انکی نوکِ زبان پہ تھے۔مشاعروں کا بڑا سے بڑا شاعر اپنا کلام پڑھ کے بیٹھتا اور ثقلین حیدر شروع ہو جاتے۔ شاعر نے جس مضمون کا شعر پڑھا تھا اسی مضمون کو میر انیس نے کیسے باندھا ہے یہ بتانا ثقلین حیدر کا کام تھا۔جس زمین میں شعر پڑھا گیا ہے اسی زمین میں مصحفی اور ناسخ کے شعر سنا دیتے۔شاعر جس ردیف قافیہ کا استعمال کرتا اسی ردیف قافیہ میں کبھی داغ دہلوی تو کبھی علامہ اقبال کے اشعار برمحل سنا دیتے۔ مشاعرہ سن رہے ہزاروں سامعین جھوم اٹھتے، واہ واہ کی صدا بلند ہوتی، لوگ ثقلین حیدر کی سخن فہمی اور زبردست یادداشت کی داد دیتے۔لیکن بیچارہ شاعر سر دھن کے رہ جاتا۔ جو داد و تحسین اس کے حصے میں آنی تھی وہ ناظمِ مشاعرہ ثقلین حیدر لوٹ لیتے تھے۔ثقلین حیدر کی زبردست نظامت کا منفی پہلو یہ تھا کہ شاعر پھیکا پڑ جاتا تھا۔نظامت چمک جاتی تھی۔

دوسرے کامیاب ترین ناظمِ مشاعرہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد تھے۔جنھوں نے مشاعروں کو کسی حد تک ادبی وقار عطا کیا۔عمر قریشی کے شہر سے ملک زادہ منظور احمد کا بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ابتدائی اور اعلیٰ

تعلیم گورکھپور میں حاصل کرنے کے بعد کچھ زمانے تک درس و تدریس کا سلسلہ بھی گورکھپور میں رہا۔ پھر اعظم گڑھ اور لکھنؤ میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ ملک زادہ منظور احمد لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو زبان و ادب کے استاد رہے۔ اردو اور انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ ہے۔ دورانِ نظامت ایک خاص معیار سے گر کر کبھی گفتگو نہیں کرتے۔ کچھ خاندانی روایت، کچھ بزرگوں کی صحبت نے ملک زادہ منظور احمد کو ایک خاص طرزِ گفتگو عطا کیا تھا۔ شاعروں کی شان میں بیجا قصیدہ نہیں پڑھتے اور اول جلول لطیفے سنا کر سامعین کے ذوق کو خراب نہیں کرتے تھے۔ آواز میں قدرتی بھاری پن اور کھنک تھی اسی لئے مائیکروفون پہ ملک زادہ منظور احمد کی آواز دوسروں کے مقابلے زیادہ بلند اور صاف سنائی دیتی تھی۔ شاعروں کو داد بھی ایک خاص کڑک دار آواز میں دیتے تھے۔ شاعروں کا تعارف کراتے وقت بیجا طوالت سے عام طور پہ بچتے تھے۔

تیسرے کامیاب ترین ناظم مشاعرہ عمر قریشی تھے۔ وہ ہندوستان کے تقریباً تمام اہم شہروں کی ادبی وراثت سے واقف تھے۔ ایک خاص بات انکے حوالے سے یہ ہے کہ وہ کبھی بھی مشاعروں میں اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ دورانِ نظامت اپنے لا تعداد اشعار برمحل سناتے تھے لیکن بطور شاعر مائک پہ آ کر اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ جبکہ دنیا کو معلوم ہے کہ وہ ایک بہترین شاعر تھے، انکے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ شہرِ صدا، زخمِ صدا وغیرہ کو بے حد سراہا گیا۔ لیکن انکی عادت تھی کہ وہ مشاعروں میں صرف نظامت کرتے تھے۔ ایک اور بات انھیں اپنے ہم عصر ناظموں سے الگ کرتی ہے کہ وہ شاعر کی قابلیت پہ بہت غور نہیں کرتے تھے۔ شاعر کسی سطح کا ہو، بطور ناظمِ مشاعرہ وہ چاہتے تھے کہ شاعر اسٹیج سے کامیاب و کامران واپس جائے۔ شاعر اور شاعری کمزور ہو تو عمر قریشی کی نظامت اسے سہارا دینے کا کام کرتی تھی۔ کسی طرح شاعر کامیاب ہو جائے اور مجموعی طور پر مشاعرہ کامیاب ہو جائے یہ عمر قریشی کی کوشش ہوتی تھی۔

چوتھے کامیاب ترین اور عظیم ناظمِ مشاعرہ جنابِ انور جلال پوری تھے۔ ملک زادہ منظور احمد کی طرح انور صاحب بھی تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں۔ لیکن آپ اردو کے نہیں بلکہ فراق گورکھپوری کی طرح انگریزی زبان و ادب کے استاد رہے ہیں۔ جلال پور کے کالج میں بھرپور تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد آپ لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے۔ انور جلال پوری اپنے خاص انداز میں کسی سنت یا ملنگ کی طرح مشاعرے کے اسٹیج پر نمودار ہوتے تھے۔ کسی محفل میں یا کسی اسٹیج پر خاموش بھی بیٹھے ہوں تو دیکھنے والا کہہ اٹھے گا کہ کوئی مفکر بیٹھا ہے۔ انکی سوچتی ہوئی دو ذہین آنکھیں اکثر بہت کچھ بیان کر دیتی تھیں۔

مشاعروں میں فنِ نظامت کے چوتھے ستون انور جلال پوری کا رنگ سخن سب سے جدا تھا۔ ثقلین حیدر، ملک زادہ منظور احمد اور عمر قریشی سے بالکل الگ انداز تھا جنابِ انور جلال پوری کی نظامت کا۔ وہ عمر قریشی کی طرح شاعروں کا تعارف انکے شہروں کے حوالے سے نہیں کراتے تھے۔ وہ ثقلین حیدر کی طرح بے شمار اشعار نہیں سناتے تھے۔ اور ملک زادہ منظور احمد سے ذرا کم ادبیت کی راہ اختیار کرتے تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر کی طرح وہ بھی جانتے تھے کہ اشعار ان کے خواص پسند ہیں مگر گفتگو عوام سے ہے۔ عوام سے بھی گفتگو کا ایک خاص سلیقہ تھا انور جلال پوری کے پاس۔ وہ سلیقہ تھا کہ عوام ان کی بات سمجھ جائیں اور خواص کے طبع نازک پہ گراں نہ گزرے۔ نظامت کا یہ سلیقہ انور جلال پوری کے ساتھ رخصت ہوا۔ اگرچہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری کے بعد کی نسل میں مشاعروں کی نظامت کے حوالے سے بالکل سناٹا نہیں ہے۔ اپنے زمانے میں معراج فیض آبادی، ڈاکٹر بشیر بدر اور منور رانا بھی اچھی نظامت کیا کرتے تھے۔ لیکن معراج فیض آبادی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اور جہاں تک بشیر بدر اور منور رانا کا تعلق ہے تو اب ان کی صحت اور عمر اجازت نہیں دیتی۔ ڈاکٹر ماجد دیو بندی اور جناب اقبال اشہر بھی نظامت کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں لیکن یہ دونوں بطور شاعر بھی خاصے مقبول ہیں۔ اس لئے عموماً مشاعروں میں نظامت سے گریز کرتے ہیں یا پھر منتظمین مشاعرہ ہی انھیں ناظم کے بجائے بطور شاعر ہی مدعو کرنا پسند کرتے ہیں۔ مرادآباد سے منصور عثمانی، گورکھپور سے کلیم قیصر، رامپور سے شکیل غوث رام پوری اور دہلی سے (وطن عزیز بجنور) شکیل جمالی و معین شاداب نے عالمی سطح پر بطور ناظمِ مشاعرہ اپنی پہچان قائم کی ہے۔ عہد حاضر میں دکن کے ممتاز شاعر ڈاکٹر سلیم محی الدین کا خیال ہے کہ اورنگ آباد، پربھنی، ناندیڑ اور امراوتی کے علاقے سے ابرار کاشف نے نظامت میں اپنی ہنرمندی سے متاثر کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر احمد کفیل کلکتہ (کولکاتا) میں مشاعروں کی نظامت کے حوالے سے ڈاکٹر عاصم شاہنواز شبلی سے اہل نظر کو امیدیں وابستہ ہیں۔ ادھر حیدرآباد میں کچھ عرصے تک محمد اسلم فرشوری نے بھی مشاعروں میں ادبی وقار قائم رکھنے کی کوشش کی۔ گلبرگہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی دھرتی ہے۔ گلبرگہ کے علمی و ادبی منظر نامے پر گہری نظر رکھنے والے ادیب ڈاکٹر غضنفر اقبال کے بیان کے مطابق گلبرگہ میں محب کوثر نے ایک زمانے تک یہ کوشش کی کہ مشاعروں کی نظامت میں پھکڑ پن نہ آنے پائے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے بنگلور کے پاس علی پور کی ادبی فضاؤں کو بھی یاد کیا ہے جہاں ناطق علی پوری اور شفیق عابدی علی پوری نے اپنی نظامت سے ہزاروں کو متاثر کیا ہے۔ امید ہے کہ کچھ اور نام ابھر کر سامنے آئیں گے اور انور جلال پوری کی شکل میں قصرِ نظامت کے چوتھے ستون کے گرنے کے بعد جو خلاء پیدا ہوا ہے اسے پُر کریں گے۔

❑❑❑

واقعی بڑے قلمکار تھے انور جلالپوری

سنجے مصرا شوق
538 kha/238، کھدرا، سیتاپور روڈ، لکھنؤ
موبائل: 9795455897

بڑے لوگ علاقائی اور لسانی دائروں سے نکل کر کھلی فضا اور ماحول میں کام کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات اور خواہشات تک محدود نہیں رہتے کیونکہ ان کے سامنے دنیا کی تعمیر و ترقی ہوتی ہے۔ ذات کے حصار اور انا کے خول میں رہنا انہیں پسند نہیں ہوتا۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں عمر عزیز تمام کر دیتے ہیں مگر زبان سے اپنی عظمت کے قصے نہیں سناتے۔ اسی لئے دنیا انہیں عظیم مانتی ہے۔ ایسی ہی ایک عظیم شخصیت تھی محترم انور جلالپوری کی۔

ہمارے بڑے قلمکاروں کا عام عیب یہ ہے کہ وہ قلم کی روشنائی انہیں پر خرچ کرتے ہیں جو تسلیم شدہ ہیں، معتبر و مستند ہیں جب کہ یہ حقیقت سبھی پر واضح ہے کہ غالب و میر یا اقبال پر آپ کتنا ہی لکھ ڈالیں، کیسی ہی عقیدتیں اور محبتیں نچھاور کر دیں، ان کی عظمت میں اضافہ ہونے سے رہا۔ ہاں لکھنے والے کی عظمت اور شہرت میں ایک اسٹار کا ضرور اضافہ ہو جاتا ہے۔

انور صاحب اس حقیقت سے کما حقہ واقف تھے اسی لئے انہوں نے اقبال اور ابوالکلام آزاد کی عظمتوں کے اعتراف کے ساتھ اپنے اساتذہ، جلالپور کے بزرگ، والد سے قرب رکھنے والے، مدرسہ سے اسکول و کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک ہر ایسے چھوٹے بڑے کا انہوں نے اپنے مضامین میں اچھے الفاظ سے ذکر کیا ہے کہ جن سے انہوں نے کچھ بھی سیکھا، سمجھا یا جانا۔ حد یہ ہے کہ اپنے عہد کے کم معروف، گمنام اور نوخیز شعراء پر بھی انہوں نے فراخدلی سے قلم کی روشنائی خرچ کی۔ حامد بہرائچی، راجیو راز، منے بخشی، قمر یاب جیلانی، ارشاد گورکھپوری اور تشنہ اعظمی بھی ان کے پیش نظر رہے اور وہ بھی جو کہ ان کے والد کے بے تکلف احباب تھے۔ ہر روز بعد مغرب مکان کے باہر بنے چبوترے پر بے تکلف محفلوں کا حصہ رہتے تھے۔ ایسے لوگو میں حاجی محمد یونس، حاجی عبدالصمد، حاجی نور محمد، صوفی دوست محمد، منشی رجب، مولوی شفیق احمد، ابوسحر، پیر محمد، احمد حسین، منشی امانت حسین، منگر بابو، عبد الرحمن، حافظ شمس الدین، عبدالحق، حافظ محمد ابراہیم کے نام بجا طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ ناموں کے فخریہ ذکر کے ساتھ انور صاحب کا قلم دیگر کام کی باتیں بھی لکھتا ہے جس سے بچپن میں ان کی تربیت، والد گرامی کے رائج عمل، ذہنی نشوونما اور بعد کے عادات واطوار کی گرہیں کھلتی ہیں اور بہت کچھ آئینہ ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ فرمائیے:

'میں نے ابھی جن ۱۵/عدد اہم شخصیات کا ذکر کیا ہے، یہ لوگ اپنے وقت میں میرے قصبہ کی آن، بان اور شان تھے۔ میرے گھر کے باہری حصہ میں بنے چبوترے کو یہ فخر حاصل تھا کہ یہ بزرگ ہر شام بعد مغرب اپنا قیمتی وقت یہاں صرف کرتے تھے۔ یہ حضرات نہ صرف میرے والد کے ہم عصر اور دوست تھے بلکہ میری تربیت میں ان میں سے بیشتر حضرات کی شفقتیں شامل ہیں۔ میرے والد اپنی حیات میں مجھ سے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ دیکھو میرے دوستو اور مخلصین کے خاندان کے لوگوں سے ہمیشہ بہتر تعلقات رکھنا۔ خدا کا شکر ہے میں ابا کی ہدایات پر آج بھی عمل پیرا ہوں۔'

انور صاحب نے تاعمر والد کی ہدایات کو زادراہ کے طور پر ہمراہ رکھا۔ بڑوں کے عزت و احترام کے ساتھ چھوٹوں پر شفقتیں لٹاتے رہے۔ مشاعروں کے اسٹیج پر کارِ نظامت کو سنبھالا تو اسے بھی اپنی محنت، لگن اور پیہم ریاض سے انتہا تک پہنچا دیا۔ اس سلسلہ میں جواں سال صحافی قاضی عبدالرحمن کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ یہاں لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

'آواز کے شہنشاہ عمر قریشی کی آواز میں ایسا جادو تھا کہ لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ میں بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل ہوں۔ میدان نظامت میں عمر قریشی اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے ہی میں نے کسب فیض کیا۔ انہیں چراغوں کی روشنی میں میرا وجود نظامت منور ہے۔ دونوں میری شخصیت میں سما گئے ہیں۔ جو میری خوش بختی ہے۔'

انور جلالپوری نے یہ اعتراف پہلی مرتبہ نہیں کیا ہے بلکہ تحریر و تقریر میں متعدد جگہ وہ ان حقائق کا

برملا اظہار کرتے رہے ہیں جس سے ان کا قد بلند سے بلندتر ہوتا گیا اور وہ کبھی اظہار حقیقت سے نہیں تھکے۔ انور صاحب کی نثر کے اصل جوہر 'روشنائی کے سفیر' نامی کتاب میں کھلتے ہیں۔ بعد کی کتابوں میں وہ اتنی توانا اور طاقتور نثر نہیں لکھ سکے۔ 'میں خود کو باندھنے میں کئی بار کھل گیا' عنوان کے تحت صفحہ ۳۸ پر یوں رقم طراز ہیں:

'مشاعروں کے اسٹیج پر آغاز مشاعرہ پر علمی وادبی تقریر کرنے کی تقلید میں میں نے محترم ملک زادہ منظور احمد کو دیکھ کر کی۔ حالانکہ میرے بزرگ اور پیشرو عمر قریشی صاحب بڑے ڈرامائی انداز اور افسانوی انداز میں شعراء کا تعارف کراتے تھے۔ کم عمری میں ان کا یہ انداز مجھے متاثر کرتا تھا مگر میں نے یہ انداز اور طریقہ اختیار نہیں کیا'

وہ مزید لکھتے ہیں:

'وہ نوعمری کے زمانے کا طلسم تھا جو نظامت کا چہرہ نہیں بلکہ غازہ تھا'

مذکورہ بالا اقتباس واضح کرتا ہے کہ انور صاحب پر عمر قریشی کی نظامت کا جو سحر تھا وہ قائم نہیں رہا جب کہ ملک زادہ منظور احمد کے طرز خطابت و نظامت کا ان کے دل و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنے ایک اہم مضمون 'جسے لکھنا ضروری تھا جسے پڑھنا ضروری ہے' میں اس اعتراف کو مجبور ہوئے۔

'ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے مجھے جذباتی لگاؤ ہے۔ میرے اس والہانہ لگاؤ کا سرچشمہ میرے والد گرامی ہیں۔ غالباً ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ جب قصبہ ٹانڈہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں علالت کے باوجود حضرت جگر مرادآبادی تشریف لائے تھے۔ مشاعرہ کے شوق اور جگر صاحب کو دیکھنے کے اشتیاق میں میرے والد ۴۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ٹانڈہ گئے تھے۔ دوسرے دن حسب عادت میرے دروازے کے سامنے چبوترے پر احباب کی محفل سجی تو کسی نے مشاعرے کی روداد پوچھی، جس پر میرے والد نے بتایا۔ بھئی مشاعرہ تو اچھا تھا ہی مگر ایک نوجوان جس کا نام ملک زادہ منظور احمد تھا، اس کی گفتگو اور تقریر نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد تازہ کرا دی۔ یقین جانئے، یہ جملہ آج بھی میرے دل و دماغ پر نقش ہے۔'

درحقیقت والد کے منھ سے ادا ہوئے ان تحسین آمیز جملوں اور عقیدتمندانہ اظہار نے انورؔ صاحب کو ملک زادہ منظور احمد کا ایسا گرویدہ بنا دیا کہ وہ تادم آخر انہیں استاد کہتے نہیں تھکے۔

احسان شناسی کے یہ جذبات پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی ذات والا صفات تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ زندگی میں جس کسی نے جہاں جس منزل پر، جس حد تک ان کا ساتھ دیا وہ اسی حد تک اظہار ممنونیت سے پیش آئے اور تحریر و تقریر میں اظہار حقیقت سے گریز نہیں کیا۔ پرائمری اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی کے اعلیٰ درجات تک، حد یہ ہے کہ مکتب کے دنوں کے اساتذہ کا انہوں نے عزت و احترام سے اپنے مضامین میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ ثبوت کے طور پر 'روشنائی کے سفیر' میں شامل یہ مضامین 'یہ بستیاں ہماری' میں خود کو باندھنے میں کئی بار کھل گیا، جسے لکھنا ضروری ہے جسے پڑھنا ضروری ہے کو بغور پڑھا جاسکتا ہے۔

معمولی معمولی واقعات کو تفصیل سے لکھنا، کسی منزل اور مقام پر پہنچ کر ابتدائی ساتھیوں، ساتھ میں گلی، ڈنڈا کھیلنے والوں، مکتب میں تعلیم دینے والے مولوی صاحب، ابتدائی درجات کے اساتذہ اور والد کے ہمراہ بیٹھنے والوں کا حسب مراتب ذکر کرنے والا معمولی نہیں ہوسکتا۔

قدرت اسے اس کی انہیں خوبیوں کے سبب نوازتی ہے اور ایسا نوازتی ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ انور صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ قدرت نے انہیں ان کے علم اور منصب سے زیادہ نوازا۔ شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ انور صاحب سے قبل بھی خاصی بڑی تعداد میں صاحبان علم نے کیا ہے۔ کام نثر میں بھی ہوا ہے اور شاعری میں بھی! صلاح الدین عرف صلّو چودھری کی یہ منظوم کاوش ۲۰۱۳ء میں سامنے آئی ہے۔ لیکن قدرت انورؔ صاحب پر مہربان تھی لہٰذا ان کی منظوم کاوش کو ہر سطح پر سراہا گیا۔ انہیں 'دیش بھارتی' بھی ملا اور 'پدم شری' بھی اور ملنا بھی چاہئے کیونکہ اچھا انسان ہی اچھا فنکار ہوتا ہے۔ انور بھائی اس پیمانے پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں خلوص و ایثار اور پیہم کام کرتے رہنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مشاعروں کے اسٹیج پر عموماً بڑے مشاعروں کا رویہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وہ غیر معروف شعراء کو نہیں پہچانتے۔ ناظمین مشاعرہ کا رویہ تو اور بھی ظالمانہ ہوتا ہے مگر انور صاحب اپنے منصب کے تئیں ایماندار تھے۔ وہ نوجوان کو سجا کر پیش کرتے، حوصلہ بخش جملوں سے ان کے قدموں کو جمانے کی حتیٰ الامکان کوشش کرتے تھے۔ ان کے اس مخلصانہ عمل کے سبب ہی عوام و خواص میں مقبولیت کے ساتھ انہیں نوجوانوں کا التفات اور قرب بھی نصیب ہوا۔

مشاعروں کے دلچسپ واقعات، زندگی کے نشیب و فراز، نیرنگیاں اور محرومیاں بڑے سمجھے جانے والے شعراء کی کمزوریاں، گمنام و کمنام شعراء کی خوبیاں، نوجوانوں کی مخفی صلاحیتیں، قصبات و دیہات کی فضا، ماحول اور تہذیبی رویوں کا فرق، ترقی یافتہ ممالک میں اردو کے فروغ کے اسباب، ان کی فکر، انداز ترقی کی وجوہ اور ہماری تنزلی کے اسباب، اپنی ۳۸ سالہ تدریسی زندگی کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھ سکتے تھے جو کہ دنیا کے بڑے قلمکاروں نے لکھا اور جو بعد

میں نہایت دلچسپی سے پڑھا گیا۔ قدرت اللہ شہاب کا 'شہاب نامہ' ممتاز مفتی کی 'الکھ نگری' اور 'علی پور کا ایلی' کے بعد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی 'رقص شرر' اور قیصر تمکین کی 'خبر گیر' کو سوشل میڈیا کے دور میں بھی لوگ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں۔

ان کی زندگی سے متعلق 'روشنائی کے سفیر' نامی کتاب میں ۳۰/مضامین ایسے شامل ہیں جو انور صاحب کی زندگی، والدین کی مشقت، جفاکشی، ایمانداری، تہذیبی روپئے، قصبہ کا گنگا جمنی ماحول، معاشی صورت حال، تعلیم کا آغاز، مکتب سے علی گڑھ یونیورسٹی تک تعلیمی مراحل کی روداد کے علاوہ بھی بہت سی ایسی باتیں درج ہیں کہ جنہیں مزید وسعت بخشنے کی ضرورت تھی مگر مضمون کی طوالت یا تنگی وقت کے باعث تفصیل طلب باتوں کو اس طرح سمیٹا گیا ہے کہ جیسے سمندر کو کوزہ میں بھر دیا گیا ہو۔ اس بات کا احساس انور صاحب کو بھی تھا، اسی لئے وہ لکھتے ہیں۔ سچ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھ دیا اور یہ بھی سچ ہے کہ بہت کچھ نہیں لکھا۔ آنے والا وقت بھی بہت سے تجربات اور مشاہدات دے گا اور نتائج نکلیں گے۔ انشاء اللہ پھر کبھی اپنی بندھی ہوئی زندگی کی گرہیں کھولوں گا۔

(میں خود باندھنے میں کئی بار کھل گیا، روشنائی کے سفیر، ص ۵۳)

وہ ۱۸/کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے مگر شریمد بھگوت گیتا پر ان کے کام نے ان کی شہرت کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ 'اردو شاعری میں گیتا' جناب انور جلالپوری کا ایسا کارنامہ ہے کہ جو زبان و بیان کی روانی، سلاست اور خوبی کے سبب ہر پڑھنے والے کو گرویدہ بنا لیتا ہے۔ انور جلالپوری عام آدمی نہ تھے۔ انہیں گیتا کا گیان حاصل ہو گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گیتا کا صحیح گیان نعمت عظمیٰ ہے، جسے یہ گیان حاصل ہوا اور وہ اس گیان سے کما حقہ دنیا کو واقف کرانے کا اخلاقی، قلمی و علمی فریضہ انجام دے، وہ عام آدمی کی صف سے نکل کر بہت بلند ہو جاتا ہے۔ انور صاحب نے اپنے عمل سے یہ بلند مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔

دیکھئے، انور جلالپوری نے کس مہارت، سلیقہ اور ہنرمندی سے پہلے باب میں جنگ کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔

وہ میداں جو تھا جنگ ہی کے لئے
وہیں سے چلے دھرم کے بھی دئے
ہمیں فخر بھیشم پتاماں پہ ہے
کہ جن کا اثر ساری دنیا پہ ہے
مگر اپنے دشمن بھی کچھ کم نہیں
انہیں مرنے جینے کا کچھ غم نہیں
وہاں پانڈوؤں کی عجب شان ہے
کہ لاکھوں میں بھی ان کی پہچان ہے
وہ چمکے تو شرما گیا شیر بھی
وہ گرجے تو غش کھا گیا شیر بھی
پتاماں کا بجنے لگا شنکھ جب
تو میداں میں گھبرا گئے سب کے سب
وہی شنکھ جو آسمانی بھی ہے
حقیقت بھی ہے اور کہانی بھی ہے
وہی شنکھ پانچ جن ہے جس کا نام
دکھایا اسی شنکھ نے اپنا کام

مطالعہ کے شائقین کو ہر باب بلکہ ہر صفحہ پر وہی روحانی کیفیات ملے گی جو کہ پہلے باب کی پہلی سطر سے شروع ہوتی ہے۔ ہر باب دوسرے اور دوسرا تیسرے کو پڑھنے پر آمادہ کرتا رہے گا۔ اس طرح سلسلہ منقطع کئے بغیر کتاب ایک نشست میں ختم ہو جائے گی۔ پلک جھپکتے اٹھارہ ابواب ختم ہو جائیں گے۔ یہی بھگوت گیتا کا کمال ہے کہ پڑھنے والا مزید تشنگی محسوس کرتا ہے۔ سیراب ہونے کی خواہش قدم بہ قدم آگے بڑھتے رہنے پر آمادہ کرتی ہے اور یہی آمادگی منزل مقصود تک پہنچنے کا سبب بنتی ہے اور ہر انسان بقدر ظرف و استعداد کسب نور کرتا ہے۔

انور صاحب کو شریمد بھگوت گیتا کو پڑھنے اور اس کی مشتہری کے لئے صلاحیتوں کے استعمال کا بہتر موقع ملا تو یہ معمولی سعادت نہیں تھی۔ اس خوش بختی پر انہیں جتنا نوازا جاتا، جتنی اور جن الفاظ میں ستائش کی جاتی کم تھی۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ بغیر بینک تفصیلات کے تخلیقات ارسال کرنے والے اعزازیہ کے حقدار نہیں ہوں گے۔**

زبان میسر کا غیر معمولی فنکار انور جلالپوری

امین احسن
محلہ قاضی پورہ ٹانڈہ، امبیڈکر نگر
موبائل: 9839745971

انور صاحب کا ادبی دنیا میں سکندرانہ عظمت حاصل کرنے کا سفر خاصہ طویل اور جدوجہد کی بے نظیر مثال ہے۔ ان کی پیدائش ۶ ر جولائی ۱۹۴۷ء کو قصبہ جلالپور ضلع امبیڈکر نگر (فیض آباد) میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد کا نام حافظ محمد ہارون تھا جو اپنے علاقے کی ایک مقتدر اور مانند ہستی تھے شرافت اور ادب نوازی ان کا شیوہ تھا ان کا دولت کدہ احباب علم و دانش کا محور و مرکز تھا بعد نماز مغرب دانشوروں کا اجتماع اور سیاسی و سماجی اور ادبی مسائل پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ قبل نماز عشاء اور بعد نماز عشاء دیر تک چلتا رہتا تھا جس نے آگے چل کر انور صاحب کی ذہنی تربیت اور تہذیبی شخصیت میں اہم رول ادا کیا۔

ان کے تعلیمی سفر کا آغاز مدرسہ کرامتیہ دارالفیض جلالپور سے ہوتا ہے ابتدائی تعلیم کے بعد ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم قصبہ جلالپور کے مشہور کالج نریندر دیو انٹر کالج سے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۴ء میں حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے شہر شبلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور شبلی نیشنل ڈگری کالج اعظم گڑھ میں داخلہ لے کر ۱۹۶۶ء میں گریجویشن کی سند حاصل کرتے ہیں۔ جہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب سے ہوتی ہے۔ جو اس زمانے میں شعبۂ انگریزی میں لکچرر کے عہدے پر فائز تھے۔ لیکن یہ ساتھ زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا کیوں کہ ملک زادہ صاحب گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں منتقل ہو چکے تھے گو کہ ملک زادہ صاحب نے انھیں تعلیم نہیں دی تھی پھر بھی انور صاحب انھیں اپنا استاذ گردانتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں ایم۔اے۔(انگریزی) میں داخلہ لینے کے لئے زمانہ ساز ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یعنی شہر سرسید کی طرف رخ کرتے ہیں انور صاحب ابتدائی دنوں سے ہی تعلیم کے ساتھ ساتھ بیت بازی، تقریری اور تحریری پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور سرگرم عمل رہتے تھے۔ قیامِ علی گڑھ کے دوران انھوں نے یونیورسٹی میں ایک ادبی تنظیم ''ہمراہی'' کی بنیاد ڈالی جس میں شہرت یافتہ شاعر جناب بشیر بدر وغیرہ حصہ لیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۸ء ایم اے کی سند حاصل کرنے کے بعد وطن عزیز کی طرف واپس لوٹتے ہیں اور تلاشِ معاش کے لئے سرگرداں و سرگرم عمل ہوجاتے ہیں ۱۹۶۹ء ۱۹۷۰ء میں بابا بروا داس ڈگری کالج پرویا آشرم جلالپور میں شعبۂ انگریزی میں ایڈہاک پر لکچرر ہوجاتے ہیں جہاں مستقل نوکری کے لیے امکانات تو تھے لیکن کالج شہر سے دور واقع ہونے اور مشاعروں کی مصروفیت کی وجہ سے انھیں کافی دشواریوں کا سامنا تھا۔ اسی زمانہ میں ۱۹۷۳ء میں نریندر دیو انٹر کالج میں انگریزی کے لیے ایک عہدے کا اشتہار نکلا انور صاحب بھی عرضی گزاروں میں شامل ہوگئے۔ انٹرویو ہوا اور فالِ نیک انور صاحب کے نام نکلا۔

انور صاحب ایک فرض شناش، ذمہ دار، خلیق و شفیق، متین و سنجیدہ اور ملنسار استاد تھے۔ طلبہ سے ان کا رشتہ نہایت مشفقانہ اور دوستانہ ہوا کرتا تھا مشاعروں کی مصروفیت کے باوجود بھی انھوں نے حق استادی بخوبی ادا کیا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں انھوں نے اپنے علمی اثاثے میں اضافہ کے لئے ۱۹۷۸ء میں اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے ایم۔اے۔(اردو) کی ڈگری حاصل کی ان کا تعلیمی سفر یہیں آ کے ٹھہر نہیں گیا بلکہ ۱۹۸۴ء میں اودھ یونیورسٹی میں ہی پی ایچ ڈی کیلئے رجسٹریشن کروایا جس کا موضوع تھا ''گیتا کا منظوم اردو ترجمہ اور اس کا تنقیدہ جائزہ''۔ لیکن بعض ناگزیر اسباب و حالات کے بنا پر ان کا ریسرچ ورک (تحقیقی کام) پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن ان کا مزاج ستاروں سے آگے جہاں اور بھی جیسا تھا۔ اس تحقیقی کام کی بازیافت گیتا کے منظور اردو ترجمہ میں پوری کردی۔

ان کی پوری زندگی عمل، جہد مسلسل، دیانت داری، شرافت اور فرض شناشی کی بہترین اور بے نظیر مثال ہے۔ ان کے جیسی نادر الوجود شخصیتیں کبھی کبھی خاک کے پردے سے نکلتی ہیں اور حدامکان سے آگے اپنی قادر الکلامی، جادو بیانی اور سحر انگیزی کا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی علمیت اور دانشورانہ لیاقت و صلاحیت سے اپنے افکار و خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ صفحہ قرطاس پر روشنائی سے کچھ اس طرح پرافشاں کیا ہے کہ نقش ایسے بنے کہ مٹائے نہ بنے کے مترادف ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ بصیرت، دواندیشی نگاہِ مستانہ اور ذہانت کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس یہ ستارۂ جگنونما اپنی روشنی بکھیر کر ۲ ر جنوری ۲۰۱۸ء کو اس دارِ فانی سے کوچ

کر گیا اور مالک حقیقی سے جاملا۔

انور صاحب کے علمی اور ادبی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے جس کا اجمالی جائزہ لیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات محض پندرہ سال کی عمر میں کی۔ تقریباً ۵۵/ سال پر محیط ان کا ادبی اثاثہ کافی طویل ہے انہیں نثر و نظم دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کی اردو اور ہندی میں درج ذیل تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔

(۱) کھارے پانیوں کا سلسلہ (غزلیات)
(۲) خوشبو کی رشتے داری (غزلیات)
(۳) جاگتی آنکھیں (ہندی) (غزلیات)
(۴) روشنائی کے سفیر مجموعۂ مضامین
(۵) اپنی دھرتی اپنے لوگ (ہندی) مجموعۂ مضامین
(۶) ضرب لاالٰہ، جمال محمد، بعد از خدا، حرفِ ابجد (نعتیہ شاعری کے مجموعے)
(۷) راہ رو سے رہنما تک (منظوم سیرت خلفائے راشدین)
(۸) توشۂ آخرت (پارۂ عم کا منظوم ترجمہ)
(۹) اردو شاعری میں گیتا نجلی (منظوم ترجمہ)
(۱۰) اردو شاعری میں رباعیات خیام (منظوم ترجمہ)
(۱۱) اردو شاعری میں گیتا (منظوم ترجمہ)
(۱۲) سفیرانِ ادب (مجموعۂ مضامین)
(۱۳) قلم کا سفر (مجموعۂ مضامین)
(۱۴) گوتم بدھ کی حیات و تعلیمات کا منظوم ترجمہ (غیر مطبوعہ)

مذکورہ بالا تصانیف پر تنقید اور تبصرہ کے لئے وقت درکار ہے۔ یہاں صرف سرسری جائزہ لینا مقصود ہے۔ انور صاحب کی شخصیت اور فن پر کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر منہاس کی نگرانی میں ڈاکٹر سلیم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ بیرون ملک پاکستان میں بھی کراچی یونیورسٹی میں ایک تحقیقی کام جاری ہے یہی نہیں انور صاحب کے غزلوں کے ۱۰۰ اشعار کا منظوم انگریزی ترجمہ ڈاکٹر سرفراز صاحب شبلی کالج اعظم گڑھ نے Rays of Thought کے نام سے کیا ہے جو ان کی ادبی کارناموں کی اہمیت اور افادیت کی دلالت کرتا ہے۔ حکومت ہند، ریاستی حکومتوں اور ادبی تنظیموں نے بھی انھیں درج ذیل ایوارڈس اور اعزازات سے سرفراز کیا ہے۔

(۱) یش بھارتی سمان ۱۶-۲۰۱۵ء، اتر پردیش سرکار
(۲) قومی یکجہتی ایوارڈ (اردو شاعری میں گیتا) ۲۰۱۵ء، اتر پردیش اردو اکادمی
(۳) اردو شاعری میں گیتا، ۲۰۱۵ء، بہار اردو اکادمی
(۴) اتر پردیش گورو سمان، ۲۰۱۲ء
(۵) فراق سمان، ۲۰۱۲ء
(۶) ماٹی رتن سمان، ۲۰۱۱ء
(۷) کھارے پانیوں کا سلسلہ ۱۹۸۵ء، اتر پردیش اردو اکادمی
(۸) خوشبو کی رشتے داری، ۲۰۱۱ء، اتر پردیش اردو اکادمی
(۹) ہندی ساہتیہ سمّیلن الٰہ آباد سے ایوارڈ اور سمان، ۲۰۰۲ء
(۱۰) افتخار میر ایوارڈ، ۲۰۰۳ء، میر اکادمی لکھنؤ
(۱۱) مگہر مہوتسو ایوارڈ، ۲۰۰۳ء
(۱۲) نذیر بنارسی ایوارڈ، ۲۰۰۶ء

اس کے علاوہ انور صاحب مختلف ادبی تنظیموں کے صدر اکادمی کے ممبر اور تر پردیش مدرسہ کے چیئرمین بھی رہ چکے ہیں اور کئی میگزین اور رسالوں کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی سنبھالی۔ ان کے انتقال کے بعد بھارت سرکار نے انھیں ''پدم شری'' ایوارڈ سے نوازا جو ہندوستان کا ادبی خدمات کے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔

انور صاحب نے اصنافِ شاعری میں نظم، رباعی، غزل اور نعت وغیرہ پر کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ ترجمہ نگاری اور نثری تخلیق میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ان کی تقاریر تاثراتی تنقید کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ان تمام کارناموں پر تفصیل سے گفتگو کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ بہر حال ان کی ابتدائی دور کی نظموں سے کچھ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

آؤ پھر عہد کریں دیش کی رکشا کے لئے
آؤ پھر عہد کریں امن و اہنسا کے لئے
آؤ پھر عہد کریں رونق دنیا کے لئے
مادرِ ہند کی یکجہتی و ایکتا کے لئے
آؤ طے کرلیں کہ اب جنگ نہ ہونے دینگے
عرصۂ زیست بشر تنگ نہ ہونے دینگے

سیاسی تنزلی اور اخلاقی زوال و عصری حسیت پر مبنی نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

اندھے بنے ہیں رہنما
چشم بصیرت بے ضیا
بہرے بھی سنتے ہیں صدا
پرور دگارِ دوجہاں
مجھ کو بتا جاؤں کہاں

انور صاحب کی نظمیہ شاعری کی یہ چند مثالیں ہیں، جن میں عصری حسیت کا عنصر غالب ہے اور نہایت عمدگی کے ساتھ سمویا بھی گیا ہے۔ ملک کی سیاست اور قومی یکجہتی کے لئے آج بھی اس طرح کی نظموں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی چار پانچ دہائی قبل تھی۔ ساختیاتی پہلو سے ان نظموں میں تازگی اور زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔ انور صاحب بیک وقت اردو، ہندی، عربی، انگریزی، فارسی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے اسی لئے انھوں نے رباعیاتِ خیام، گیتا نجلی، گیتا اور گوتم بدھ کی تعلیمات کا منظوم ترجمہ کیا۔ اردو شاعری میں ''گیتا'' ان کا کلیدی اہمیت کا منظوم ترجمہ

ہے جس پر انھیں پدم شری ایوارڈ حاصل ہوا۔ گیتا کے حوالے سے چند باتوں کا ذکر کرنا ضروری اور ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ گیتا کا اولین ترجمہ شہنشاہِ اکبر کے درباری اور دانشور ابوالفضل فیضی نے فارسی میں کیا تھا۔ اس کے بعد تو ترجموں کا گویا دبستان ہی کھل گیا۔ اس نظم کے اب تک تقریباً ۵۰ ترجمے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں نظیر اکبرآبادی، حسرت موہانی، یگانہ چنگیزی، حکیم محمد اجمل خاں (نغمۂ خداوندی) اور خواجہ دل محمد وغیرہ نے کیا۔ ۱۹۲۳ء میں احمد حسن الدین صاحب نے بھی ایک ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر حسان الدین (آئی۔اے۔ایس) نے بھی ''نغمۂ الوہیات'' نام سے ۱۹۴۵ء میں گیتا کا ترجمہ کیا تھا۔ جو کہ ۱۸/ابواب سات سو ایک شلوکوں پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۱ء میں پاکستان میں بھی ایک ترجمہ'' نغمۂ الٰہی'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ مشہور اردو شاعر رئیس امروہوی نے ۱۹۹۹ء میں گیتا کا ترجمہ کیا جسے بعد میں رئیس اکیڈمی نے شائع کیا۔

اس طرح اردو میں گیتا کے منظوم ترجموں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن انور صاحب کے ترجمے کی اہمیت الگ ہے کیوں کہ انھوں نے اسے بے حد آسان زبان اور شعری آہنگ میں منتقل کیا ہے۔ اس کی بحر'' بحر متقارب'' ہے جس میں مشکل اور دقیق الفاظ کا گزر آسانی سے نہیں ہوسکتا۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے ترجمہ نہیں بلکہ ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے فلسفۂ گیتا کو اتنا آسان اور عام فہم کردیا ہے کہ قاری مضمون کی روح میں اترتا چلا جاتا ہے۔

گیتا کی اشعار سلاست روانی اور زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت سادہ آسان اور عام فہم ہیں۔

ایک طرف انور صاحب نے لطیف سماجی احساسات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر ایسا سرمایہ تشکیل کیا ہے کہ جس کے بطن سے تہذیب کے چشمے رواں ہوتے ہیں اور نسلوں کو سیراب کرتے ہیں اور دوسری طرف انھوں نے ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات کے موقع پر مرزا غالب جونیئر ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی جو کہ جلالپور کے قلب میں واقع ہے اب یہی جونیئر ہائی اسکول مرزا غالب انٹر کالج کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ یہ ان کی علم دوستی دوراندیشی اور قوم پرستی کی غمازی کرتا ہے یہاں تشنگانِ علم کسب فیض کررہے ہیں، انور صاحب چاہتے تو اس موقع پر کسی شاندار جشن کا اہتمام کرسکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ کالج غالب صدی پر ان کو سچی خراجِ عقیدت کا نادر و نایاب نمونہ ہے۔ انور صاحب اس کالج کے تاحیات صدر بھی رہے۔

انھوں نے شاعری صرف جذبات اور احساسات کے اظہار کے لئے نہیں کی بلکہ جذبات اور احساسات کو تہذیب بنانے کے لئے کی ہے۔ ان کے یہاں لفظ وسیلہ بن جاتا ہے، جملہ و شعر سلیقہ بن جاتا ہے اور تحریر تہذیب بن جایا کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی تلخ و شیریں سچائیوں اور حقیقتوں کے اعتراف کی خوشبو رچی بسی ہے۔ ان کی شاعری میں خودداری اور انانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

زلف کو ابر کا ٹکڑا نہیں لکھا میں نے
آج تک کوئی قصیدہ نہیں لکھا میں نے
جب مخاطب کیا قاتل کو تو قاتل لکھا
لکھنوی بن کے مسیحا نہیں لکھا میں نے

تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے مسائل، ہجرت، فسادات، عدم استحکام، ٹوٹتے بکھرتے رشتوں، انسانی قدروں کی پامالی، مسئلہ امن وسلامتی جیسے موضوعات کو ان کی حساس طبیعت نے بہت گہرائی اور جذباتیت کے ساتھ محسوس کیا ہے مثلاً

نہ جانے کون سی مصلحت کے قیدی تھے
چلا کے تیر جو اپنی کمان چھوڑ گئے
ہمیں گلہ بھی ہے انور تو صرف ان سے ہی
جو لوگ خوف سے ہندوستان چھوڑ گئے
ہجرت کے چراغوں سے کیا تھا جسے روشن
اس شہر کراچی میں تماشا بھی ہمیں ہیں
تم پیار کی سوغات لئے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا
آج کل تنہا سفر دل میں دھڑکتا ہے بہت
بے یقینی کا یہ منظر دیکھئے کب تک رہے

بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور اکیسویں صدی میں سماجی تانہ بانہ بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوا ہے۔ خودغرضی، مادّیت پرستی، تنہائی پسندی، استحصال اور برتریت کے جذبوں سے پیدا ہونے والے مسائل پر ان کی نظریں مرکوز تھیں۔ حساسیت سے لبریز چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

زندگانی ترا حلیہ کبھی ایسا تو نہ تھا
جیسا اب ہے تیرا چہرہ کبھی ایسا تو نہ تھا
دل کہیں، ذہن کہیں، جسم کہیں، روح کہیں
آدمی ٹوٹ کے بکھرا کبھی ایسا تو نہ تھا
دل سے تڑپ رگوں سے حرارت چلی گئی
ورثے میں جو ملی تھی وہ دولت چلی گئی
کس نے کس سے پیا رکیا ہے
سب نے کاروبار کیا ہے

انور صاحب مسائل حیات اور ہنگامہ زیست سے بخوبی واقف ہیں انھیں حیاتیاتی نفسیات پر گہرا عبور حاصل ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں داخلی کیفیات اور حوادثِ کائنات ایک دوسرے میں تحلیل ہوجاتے ہیں اور ہماری سماعتوں کو پاکیزگی اور تازگی سے معمور کردیتے ہیں۔ دلوں کو اطمینان و سکون اور طبیعت کو فرحت بھی بخشتے ہیں مثلاً

دل کسی کا ہو مقدس ہے حرم کی مانند
اس عمارت کو گرانے کی سزا پاؤ گے

کچھ وصف تو ہوتا ہے دماغوں میں دلوں میں
یوں ہی کوئی سقراط و سکندر نہیں ہوتا
مسلسل دھوپ میں چلنا چراغوں کی طرح جلنا
یہ ہنگامے تو مجھ کو وقت سے پہلے تھکا دینگے
جو مذہب اوڑھ کے بازار نکلے
ہمیشہ ان اداکاروں سے بچنا

غرض یہ کہ انور صاحب رنگارنگ مضامین کو شعری آہنگ میں اسلوبیاتی ندرت وسادگی وشگفتگی کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آمیز کیا ہے کہ معیارِ فن بھی قائم ہے اور موضوع کو گنجلک ہونے سے بچایا بھی ہے ان کے یہاں معنی آفرینی کی آئینہ داری درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ان کی فکر واحساس کشادگیٔ ذہن اور دوررس نگاہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ان کی بصیرت کا دائرہ محدود نہیں بلکہ لامحدود ہے وہ ہم نوائے وقت اور حقیقت نگار بھی۔

انور صاحب کی نثر نگاری بھی اعلیٰ درجے کی ہے جس کا طویل اور تفصیلی جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں ہے۔ان کی نثر شاعرانہ مقناطیسیت کی غمازی کرتی ہے اور کہیں نہ کہیں رجب علی بیگ سرور، شبلی نعمانی اور ابوالکلام آزاد کے قلم کے جادو کا احساس کراتی ہے ان کے نثری کارنامے بھی کچھ کم نہیں ہے بلکہ شہرت دوام کیلئے کافی ہیں چند اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''سرسید کی دور اندیشی، حالی کا درد، اکبر الٰہ آبادی کے سینے کی تڑپ، مولانا شبلی کے اسلاف سے عقیدت، مولانا قاسم نانوتوی کی آنکھوں کا نور یہ سارے عناصرِ ترکیبی اگر اکٹھا کردیئے جائیں اس سے اقبال کا پیکر بن جائے گا.....اقبال کے یہاں دعائیں نہیں بلکہ عمل کی فاختائیں ہیں وہ مایوسی اور غم کے شاعر نہیں بلکہ باعمل مجاہدانہ زندگی کے نغمہ گر ہیں.....اردو میں پہلی مرتبہ اقبال نے شاعری سے ہدایت، صداقت، سخاوت، شجاعت اور شہادت کا کام لیا ہے۔انھوں نے ذہن کی قوت اور روح کی طاقت کو ہم آغوش کردیا۔ان کی شاعری نظر کو نور اور دل کو سرور بخشتی ہے۔معرکۂ روح وبدن کے اختتام پر روح کی فتحیابی اقبال کی مجموعی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ (روشنائی کے سفیر بعنوان اقبال کی عبقریت)

۱۹۶۲ء میں قصبہ جلالپور کے مشاعرے کی نظامت مشہور زمانہ ناظم مشاعرہ و شاعر عمر قریشی صاحب نے کی تھی جس کی روداد انھوں نے روشنائی کے سفیر میں بعنوان ''میرے ذہن کا پہلا ساحر عمر قریشی'' میں انور صاحب رقمطراز ہیں.....

'مشاعرہ ختم ہوا۔صبح ہوئی۔عمر صاحب اپنے وطن گورکھپور روانہ ہوگئے مگر میرے قصبے میں تعریفوں اور تبصروں کا ایک موسم چھوڑ گئے۔رات گذر چکی تھی نرم ونازک صبح نوخیز کا چہرہ بھی دھوپ سے مرجھانے لگا تھا مگر عوام پر تمام شب کا نشہ تھا کہ اترتا ہی نہیں تھا۔عمر صاحب کی گل افشانیٔ گفتار پر تبصرہ کرنے میں جوان و ادھیڑ اور بوڑھے اپنی عمروں کا فرق بھول گئے تھے۔نادر شاہ نے کبھی دلی کو لوٹا ہوگا مگر اس رات تو عمر صاحب میرے دیار کے سخن فہموں کا دل لوٹ کر چلے گئے۔'

یہ اقتباس انور صاحب کی جادو بیانی وگل افشانی اور عبارت آرائی کے نہ صرف مظہر ہیں بلکہ اس طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ ان کی تحریر وتقریر میں عمر قریشی صاحب کا پرتو صاف طور پر جھلکتا ہے۔صحیح معنوں میں انور صاحب نے نظامت کے حوالے سے اگر کسی کی تقلید کی ہے تو وہ صرف اور صرف عمر قریشی صاحب کی۔

بحیثیت مجموعی انور جلالپوری صاحب ایک کثیر الجہت اور کارواں صفت شخصیت کے مالک ہیں جن کی عظمت کا سکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی انفرادیت کے لئے یکساں طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، ناقد بھی ہیں اور ناظم بھی، مفکر بھی ہیں اور مدبر بھی۔محبت اور امن ورواداری کے پاسبان بھی ہیں اور انسانیت کے علمبردار اور نگہبان بھی۔مشترکہ تہذیبی روایت وور اثت کے نقیب ورفیق بھی ہیں، اور فرقہ واریت، تعصب، تنگ نظری اور نفرت کے رقیب بھی۔صاحب علم ودانش بھی ہیں اور زمانہ شناس بھی۔فہم وفراست کے مالک بھی ہیں اور سنگلاخ راستوں کے مسافر اور راہی بھی۔امن کے پیغامبر بھی ہیں اور پاسدارِ یکجہتی و یگانگت بھی۔ رازہائے تیشۂ فرہاد سے آشنا بھی ہیں اور لیلائے محبت کے دم ساز بھی۔زبانِ اردو اور شیرینیٔ گفتار کے پیش رو بھی ہیں اور لفظوں کے جادوگر بھی ایک کامیاب معلم بھی ہیں اور محافظ خادم اردو بھی۔جدید عصری میلانات سے آگاہ بھی ہیں اور قدیم تاریخی دستاویز کے نظر شناس بھی۔ زمانہ ساز بھی ہیں اور علم وحکمت کے چراغ بھی۔غرض یہ کہ انور صاحب ایک ایسے تراشیدہ ہیرے کے مانند ہیں جو مختلف زوایوں سے روشنی اور قوس وقزح کے رنگ بکھیرتا ہے، جگمگاتا اور جھلملاتا ہے انھیں لفظوں پر اس قدر ملکہ وقدرت حاصل ہے کہ جب وہ شاعری کرتے ہیں یا نثر لکھتے ہیں تقریر کرتے ہیں یا تبصرہ تو لفظ ان کی جلو میں اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ کبھی رقص کناں ہوتے ہیں اور کبھی سربسجود۔ان کے جملوں اور اشعار میں لفظوں کی ترتیب کسی خوبصورت پھولوں کے ہار جیسی ہوتی ہے جو اپنی خوشبو اور عطر بیز کیفیت سے قارئین اور سامعین کو نہ صرف محظوظ کرتا ہے بلکہ سماعتوں اور دل ودماغ کو تازگی وفرحت اور سرور انبساط بھی بخشتا ہے۔ان کی آواز کی غنائیت اور سحر انگیزی سے بادِ سموم نسیم صبح کے تازہ جھونکوں میں تبدیل ہوجایا کرتی ہے۔ان کی تحریر وتقریر اور شاعری میں دریا کی سی روانی اور پہاڑی آبشاروں کی کھنک کا احساس ہوتا ہے۔یہی ان کا سب سے بڑا کمال اور طرۂ امتیاز ہے۔

❑❑❑

انور جلالپوری

بھگود گیتا کے منظوم ترجمے کے اقتباسات

تھی تیار بھیشم پتامہ کی فوج
گرجدار جیسے سمندر کی موج

یہ منظر جو ارجن کو آیا نظر
اٹھایا دھنش اس نے بھی بے خطر

کہا اس نے اے مالک روح و جاں
یہ رتھ لے چلیں فوج کے درمیاں

عجب حال ارجن کی آنکھوں کا تھا
بڑی دیر تک صرف آنسو بہا

تو پھر کرشن نے اس سے پوچھا یہی
کہاں سے ہے سیکھی بتا بزدلی

یہ سب علم سے دور کی بات ہے
جہالت کی، مجبور کی بات ہے

اٹھو جنگ کے واسطے اٹھ پڑو
لئے ہاتھ میں اسلحے اٹھ پڑو

بہت عقل سے ہے بڑی آتما
کہ اس سے بڑا صرف پرماتما

میں ہوں بے عمل ایک پل کو اگر
تو ہو جائے دنیا ادھر کی ادھر

تو اپنی حقیقت کو اب جان لے
ترے پاس کیا کچھ ہے پہچان لے

ہوس تیاگ، دنیا ہے تیرے لئے
یہ سارا زمانہ ہے تیرے لئے

کرشنا نے تفصیل سے پھر کہا
ہر اک راز ارجن کو سمجھا دیا

مرا جنم لوگوں کے جیسا نہیں
کہ میں خاص ہوں ایسا ویسا نہیں

ازل سے ہوں میں اور اجنما ہوں میں
اکیلا ہوں میں اور تنہا ہوں میں

کرشنا نے ارجن سے پھر یہ کہا
کہ یہ راز مجھ کو بھی دیجے بتا

کہ کرموں سے دوری بھی معقول ہے
اور اس سے حضوری بھی معقول ہے

مجھے صاف لفظوں میں سمجھایئے
حقیقت ہے کیا اس کو بتلایئے

جواب اس کا کرشنا نے ایسا دیا
کہ ارجن کی الجھن کو سلجھا دیا

ہے ارجن! تپسوی سے یوگی بڑا
جہاں بھر کے گیانی سے یوگی بڑا

میں کہتا ہوں اٹھ یوگ کی راہ لے
کہ اس راستے ہی میں سب کچھ ملے

عقیدہ عقیدت جو مجھ میں رکھے
جو دیکھے مجھے چشم ایمان سے

سدا میرے نزدیک افضل وہی
وہی شخصیت کا مکمل وہی

او کنتی کے بیٹے تو اب جان لے
حقیقت مری کیا ہے پہچان لے

جو سمجھیں مجھے مالک کائنات
مجھی میں ہے کل دیوتاؤں کی ذات

ارادوں میں مضبوط ہیں جس کے دل
کریں یاد مجھ کو وہی مستقل

نہ بھولیں مجھے موت کے وقت بھی
کہ ہر پل رہے جس گھڑی سخت بھی

یہاں آکے ارجن پریشان ہیں
سوالات کرکر کے حیران ہیں

برہم کیا ہے، روحانیت کیا عمل
بتائیں کہ کیسے ہو جیون سفل

بتائیں مجھے پنچ تتوا ہیں کیا
عناصر کو سمجھوں میں کیسے بھلا

سبھی دیوتاؤں کا کیا گیان ہے
زمانے میں کیوں ان کا سمان ہے

ہے ارجن! نہ کر گن کی اوگن کی بات
ترے دھیان کا کیندر ہے میری ذات

عقیدت سے تو گیان کی اور چل
اسی سے رہے گا ہمیشہ سفل

میں ہوں ایشور سارے سنسار کا
میں خالق ہوں ہر شکل و آکار کا

میں سورج کی گرمی ہوں بارش ہوں میں
کرم، رحم ہوں اور نوازش ہوں میں

بھلا دوسروں کا جو چاہیں سدا
رکھیں غیر جن سے بہت آسرا

وہ آخر میں مجھ سے ہی مل جائیں گے
کنول انکے دل کے بھی کھل جائیں گے

جہاں حسن ہے شان و شوکت جہاں
مرا نور ہے اس میں جلوہ فشاں

ہے قائم مرے یوگ سے یہ جگت
یہ برہمانڈ میری ہی ہے سلطنت

عجب کیفیت میں پھر ارجن پڑا
خداوند سے اس نے کچھ یوں کہا

پڑھایا جو روحانیت کا سبق
ہوا اس سے ہر شک کا سینہ ہی شق

فقط آپ زندہ ہیں فانی ہیں سب
حقیقت ہیں آپ اور کہانی ہیں سب

دکھا دیں مجھے غیر فانی سروپ
جو ہے علم کا اور گیانی سروپ

کرشنا نے کچھ یوں مخاطب کیا
جو تھا راز ارجن کو بتلا دیا

مہرشی ہو یا دیوتا ہو کوئی
مرا جنم کب ہے نہ جانے کبھی

کہ ان کے جنم کا سبب میں ہی ہوں
میں پالوں انہیں ان کا رب میں ہی ہوں

گناہوں سے وہ شخص پائے نجات
ازل سے جو سمجھے کہ ہے میری ذات

تو ارجن نے کیشو سے یہ کہہ دیا
تعلق ہے کیا جسم اور روح کا

ہوا، آگ، آکاش، جل، خاک سے
بدن ہے بنا کتنے ادراک سے

عمل علم کے جتنے بھی ہیں حواس
اہنکار، بدھی کریں ان میں باس

انہیں سے ہے تشکیل اس جسم کی
انہیں سے ہے تکمیل اس جسم کی

یہی گن تو کرموں کا بنتے سبب
انہیں کی بدولت تو ہیں کام سب

مگر چپ ہے خاموش ہے آتما
کہ ہے اس کا رتبہ بہت ہی بڑا

سمجھ لیں جو اسکو وہ میرے بنیں
حقیقت کو سمجھیں اسی میں رہیں

انہیں چھوڑ کر جو بنے فتحیاب
وہ پیری جوانی میں ہوں کامیاب

وضاحت سے باتوں کو پھر یوں کہا
خداوند نے سب کو سمجھا دیا

جگت کیا ہے پیپل کا اک پیڑ ہے
بندھی ہے مثالوں سے ہر ایک شئے

عجب پیڑ جس کی جڑیں تو ہیں پست
مگر اس کی شاخیں تو اوپر ہیں مست

ہیں پتے کہ جیسے وچن وید کے
حسیں اتنے جیسے سخن وید کے

خدائی صفت کے ہیں جتنے بھی گُن
مرے منھ سے ارجن انہیں آج سُن

پڑھا کر مقدس کتابیں سدا
ریاضت، دیانت سے رکھ واسطہ

نڈر بن مگر صاف رکھ دل کا گھر
سدا تیاگ کر اور خیرات کر

اہنسا، صداقت کو اپنا بنا
تلوّن مزاجی سے رکھ فاصلہ

ادب سے پھر ارجن مخاطب ہوا
خداوند عالم صفت سے کہا

جنہیں شاستروں سے ہی رغبت نہیں
انہیں ان سے کوئی عقیدت نہیں

ستوگن، رجوگن سے کیا واسطہ
تموگن سے ان کا ہے کیا سلسلہ

شرّدھا کا ان کی ہے معیار کیا
کہیں ان کو ہم لوگ سرکار کیا

مہاراج! مجھ کو ہے بیحد خوشی
کہ جیسے مجھے سلطنت مل گئی

میں خوش ہو کے اعلان کرتا ہوں اب
بتاتا ہوں دنیا کو یہ با ادب

وہیں فتح مندی، مسرت وہیں
سبھی کے لئے شان و شوکت وہیں

تعزیتی نظم

ایک راہی تھا جو میر کارواں بن کر اٹھا
اک سپاہی تھا جو قومی ترجماں بن کر اٹھا

راہ میں دشواریوں کے موڑ بھی آئے مگر
امتحان زندگی میں کامراں بن کر اٹھا

پاس تھا محنت کا زر، اخلاص کی چاندی بھی تھی
ہاتھ اس کا دستگیر بیکساں بن کر اٹھا

شاعر و ناظم کرم گستر، ادب پرور جو تھا
اسکا ہر جملہ ادب کی روح و جاں بن کر اٹھا

شور سے ناقوس کے جب تھی سماعت دم بخود
ایسے عالم میں وہ آواز اذاں بن کر اٹھا

چپ ہوئے جب لب، تو خاموشی لگی کرنے کلام
اسکا ہر انداز بھی ایک داستاں بن کر اٹھا

ایک انور کا جنازہ اور تھی کاندھوں کی بھیڑ
ایک ذرّہ تھا جو رشک کہکشاں بن کر اٹھا

ناز سے کہتی ہے انور کے وطن کی سر زمیں
میری دھرتی کا جیالا آسماں بن کر اٹھا

بول اٹھے سب لوگ، جب دیکھا جنازے کا ہجوم
ایک قطرہ تھا جو بحر بیکراں بن کر اٹھا

تیسری تھی جنوری کی بدھ کا دن تھا ذوالفقار
جب جنازہ گھر سے انکی عز و شاں بن کر اٹھا

ذوالفقار جلالپوری
محلہ کریم پور، پوسٹ نگپور، جلالپور، امبیڈکر نگر
موبائل: 9415751528

قطعات

حضرتِ انورؔ فقط ناظم نہ تھے
شعر گوئی میں بھی رکھتے تھے کمال
حمد و نعت و منقبت، نظم و غزل
اُن کی تخلیقات سب ہیں لا زوال

●

خوش ہوں یا غمگین ہوں ہر حال میں
زندگی بھر شکرِ رب کرتے رہے
دارِ فانی میں رہے جس وقت تک
خدمتِ اردو ادب کرتے رہے

●

جہد و عمل کا پیکر انورؔ جلال پوری
شعر و ادب کا محور انورؔ جلال پوری
مخمورؔ معترف ہیں سب اُن کی عظمتوں کے
دانشور و سخنور انورؔ جلال پوری

ڈاکٹر مخمورؔ کاکوروی
۶۸۔ چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ
موبائل: 9450097929

اثرؔ لکھنوی
۱۸۸۵ء ۱۹۶۷ء

غزل

دل گیا بے قراریاں نہ گئیں
عشق کی خامکاریاں نہ گئیں

مر مٹے نام پر وفا کے ہم
تیری بے اعتباریاں نہ گئیں

لب پہ آیا نہ اس کا نام کبھی
غم کی پرہیز گاریاں نہ گئیں

کھپ گئی جان بجھ گئے تیور
اشک کی تابداریاں نہ گئیں

توبہ کرنے کو ہم نے کی تو مگر
توبہ کی شرمساریاں نہ گئیں

جان آ ہی گئی لبوں پہ مگر
شوق کی پردہ داریاں نہ گئیں

وہ ہے کینہ کہ سرد مہری ہے
اپنی جانب سے یاریاں نہ گئیں

گریہ بھی ہے اثرؔ کا مستانہ
نہ گئیں بادہ خواریاں نہ گئیں

یہ سوچتے ہی رہے اور بہار ختم ہوئی
کہاں چمن میں نشیمن بنے کہاں نہ بنے

اثرؔ لکھنوی نے جب ہوش سنبھالا تو لکھنؤ کی تہذیب اور تمدن پر زوال آ چکا تھا۔ ان کا بچپن اس لکھنؤ میں گزرا جس نے نوابین اودھ کی شان و شوکت کو لٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ لکھنؤ کی عنان حکومت اب فرنگیوں کے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔ ان کی جدید مغربی تہذیب لکھنؤ میں پیر جمانے کے جتن کر رہی تھی۔ اثرؔ لکھنوی پر بھی اس کا زبردست اثر ہوا اور وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوئے، کئی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور کچھ عرصہ ریاست جموں کشمیر میں بھی بطور سربراہ اپنی خدمات انجام دیں۔ حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں 'پدم بھوشن' سے بھی نوازا۔ روزانہ کی سرکاری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادب سے ان کا تعلق قائم رہا اور انہوں نے روایتی مزاج کی عشقیہ شاعری جاری رکھی۔ عزیزؔ لکھنوی ان کے استاد ہوا کرتے تھے۔

شاعری کے علاوہ انہوں نے ادبی موضوعات پر مضامین بھی تحریر کئے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'چھان بین' کے نام سے شائع ہوا۔ میر انیسؔ اور مرزا غالبؔ پر ان کی تحریر کردہ کتابیں بھی خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا اصل نام مرزا جعفر علی خاں تھا، اثرؔ تخلص رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی ایسے مشہور مرثیے بھی لکھے جو ابھی بھی لکھنؤ کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول اور مزاج والی تہذیب کی نمائندگی کرنے والے شعراء میں اثرؔ لکھنوی کا اہم نام ہے۔ اثرؔ لکھنوی کے اشعار خالص لکھنوی عشقیہ مزاج کے تصور کئے جاتے ہیں۔ اثرؔ لکھنوی کے ۱۳۳ ویں یوم ولادت کے موقع پر ادارہ 'نیا دور' کی جانب سے پیش ہے ان کی تین غزلیں۔

غزل

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی ادھر آئی ادھر گئی

مشاطۂ بہار عجب گل کتر گئی
منہ بند جو کلی تھی کھلی اور سنور گئی

پیش جمال یار کرن آفتاب کی
شرما کے چاہتی تھی کہ پلٹے بکھر گئی

مل کے بھبھوت چہرے پہ تاروں کی چھاؤں کا
دھونی رمائے در پہ یہ کس کے سحر گئی

کیا جانے آنکھ مار کے کیا کہہ گئی شفق
پھولوں کی گود موج نسیم آ کے بھر گئی

سینے میں اور تاب دے شعلے کو شوق کے
سجدہ غلط اگر نہ تجلی نکھر گئی

تیری ہی جلوہ زار ہے دنیائے رنگ و بو
اے وائے وہ نظر جو حجابات پر گئی

اب ہاتھ ملتے ہیں کہ دم عرض ماجرا
کہنے کی بات دھیان سے کیسے اتر گئی

کچھ دن کی اور کشمکش زیست ہے اثرؔ
اچھی بری گزرنی تھی جیسی گزر گئی

غزل

چپکے سے نام لے کے تمہارا کبھی کبھی
دل ڈوبنے لگا تو ابھارا کبھی کبھی

ہر چند اشک یاس جب امڈے تو پی گئے
چمکا فلک پہ ایک ستارا کبھی کبھی

میں نے تو ہونٹ سی لیے اس دل کو کیا کروں
بے اختیار تم کو پکارا کبھی کبھی

زہر الم کی اور بڑھانے کو تلخیاں
بے مہریوں کے ساتھ مدارا کبھی کبھی

رسوائیوں سے دور نہیں بے قراریاں
دل کو ہو کاش صبر کا یارا کبھی کبھی

قطرہ کی ایک موج یہ کہتی نکل گئی
ساحل سے مصلحت ہے کنارا کبھی کبھی

اے شاہد جمال کوئی شکل ہے کی ہو
تیری نظر سے تیرا نظارہ کبھی کبھی

ہنگام گریہ آہ سے ناداں اثرؔ حذر
اڑتا ہے اشک جیسے شرارہ کبھی کبھی

انور جلالپوری کے منتخب اشعار

اے منصف دوراں بتا ہم کس سے مانگیں خوں بہا
مقتل ترا، مشہد ترا، قاتل ترے، خنجر ترا

دل بھی کیا عجب شئے ہے کیسی اسکی فطرت ہے
دیر تک سلگتا ہے پر دھواں نہیں کرتا

امیر شہر اسی غم میں رات سو نہ سکا
غریب شہر کے تن پر ابھی ردا کیوں ہے

وہ بادشاہ بھی سانسوں کی جنگ ہار گئے
جو اپنے گرد ہمیشہ سپاہ رکھتے تھے

شہروں کے شور وغل نے یہ سمجھا دیا ہمیں
کتنا سکون گاؤں کے کچے گھروں میں تھا

سنگ ان ہاتھوں میں دیکھا جنہیں سمجھا میں نے
یہ تو اپنے ہیں بھلا اپنوں سے خطرہ کیا ہے

ہر کوئی منظر یہاں اک عارضی تصویر ہے
خواب کوئی اپنی آنکھوں میں سجائیں کس لئے

رفتار میں لچک ہے تو گفتار میں مہک
یارب یہ لوگ کون سی دنیا سے آئے ہیں

مقتل کے اداکار یہی لوگ ہیں جن کے
نازک ہیں بدن ہاتھ میں خنجر بھی نہیں ہے

کوئی پوچھے گا جس دن واقعی یہ زندگی کیا ہے
زمیں سے ایک مٹھی خاک لے کر ہم اڑا دینگے

راز یہ کھلتا نہیں کیسے گلستاں جل گیا
دیکھنے میں تو کہیں کوئی بھی چنگاری نہ تھی

مری جدائی ترے دل کی آزمائش ہے
اس آئینے کو کبھی شرمسار مت کرنا

کون سی بستی میں یارب تو نے پیدا کر دیا
دشمنی پر سب ہیں آمادہ خفا کوئی نہیں

بیٹھے ہوئے ہیں ڈھیر پہ بارود کے مگر
پر امن زندگی کی دعا چاہتے ہیں لوگ

یہ البیلی سہانی چاندنی اک خواب ہے پیارے
کہ جب سورج نکلتا ہے تو سپنے ٹوٹ جاتے ہیں

ہر ایک شئے کی بڑی دیکھ بھال کرتے ہیں
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

شہرت کو سیاست کی کثافت سے بچا لے
عزت مجھے مغرور نہ ہونے کے لئے دے

میں نے ہر عہد کی لفظوں سے بنائی تصویر
کبھی خسروؔ، کبھی خیامؔ، کبھی میرؔ ہوں میں

دل کسی کا ہو مقدس ہے حرم کی مانند
اس عمارت کو گرانے کی سزا پاؤ گے

کہہ گیا کوئی سرِ دار و رسن
تیری خاطر جو ہوا اچھا ہوا

ختم ہونے ہی نہ پائے چاہتوں کا سلسلہ
پھول میں رنگت کلی میں تازگی جب تک رہے

مرے مالک مجھے آسانیوں نے کر دیا بزدل
مرے رستے میں اب ہر گام پر اک مرحلہ رکھنا

اہل دل اس کو دل سمجھتے ہیں
یہ ہے ہندوستان کی دلّی

میں اتنی تیز اپنی منزلوں کی سمت دوڑا ہوں
کہ مجھ کو وقت سے پہلے تھکن معلوم ہوتی ہے

وہ جس کو پڑھتا نہیں کوئی بولتے سب ہیں
جناب میرؔ بھی کیسی زبان چھوڑ گئے

میرے حالات پہ تم رشک تو کرتے ہو مگر
تم نے دیکھا ہی نہیں ہے مرا محنت کرنا

روح کی پاکیزگی دل کا سکون اس دور میں
چھین کر ہر اک سے ذہن تاجرانہ لے گیا

تنقید مجھ پہ کی تو میرے دوستو نے کی
حد درجہ رکھ رکھاؤ مرے دشمنوں میں تھا

موسم کے ساتھ سارے مناظر بدل گئے
لیکن یہ دل کا زخم ہرا تھا ہرا رہا

سچائیوں کی جیت یقین تھی دوستو
بازی مگر لگانی پڑی اس میں جان کی

دشمنی اور دوستی پہلے بھی ہوتی تھی مگر
اس قدر ماحول کا ماحول زہریلا نہ تھا

ہم مسافر ہیں ہمیں رکنے ٹھہرنے کے لئے
آپ کے گھر میں نہیں دل میں ٹھکانا چاہئے

جو مجھ سے دشمنی کھل کر نبھائے
مجھے وہ آدمی اچھا لگے ہے

کوئی موسم ہو کوئی بھی سماں اچھا نہیں لگتا
تمہارے بعد اپنا ہی مکاں اچھا نہیں لگتا

اس ناامید شخص نے یوں کی ہے خودکشی
ناخن کی تیز دھار کو خنجر بنا لیا

غلط کاموں کا اب ماحول عادی ہو گیا شاید
کسی بھی واقعہ پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا

دل جلا دو کہ تیرگی مٹ جائے
ان ستاروں میں روشنی کم ہے

ہو نہ ہو شعلوں کی زد میں آ گیا پھر کوئی گھر
میری آنکھوں میں یہ چنگاری کہاں سے آ گئی

سبھی کے اپنے مسائل سبھی کی اپنی انا
پکاروں کس کو جو دے ساتھ عمر بھر میرا

گاؤں چھوڑا شہر پہنچے بھول بیٹھے بولیاں
اب بڑے شہروں میں لوگوں کی زباں کوئی نہیں

تو مجھے پا کے بھی ناخوش تھا یہ قسمت تیری
میں تجھے کھو کے بھی خوش ہوں یہ جگر میرا ہے

تم پیار کی سوغات لئے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا

کچھ دنوں سے اک عجب معمول ان آنکھوں کا ہے
کوئی آئے یا نہ آئے پھر بھی رستہ دیکھنا

میں جنگ ہار کے بھی معتبر سپاہی ہوں
مری نیام میں شمشیر جو ہے میری ہے

تہمتیں آئیں گی نادر شاہ پر
آپ دلّی روز ہی لوٹا کریں

آج میں نے اپنے غم کا اس سے شکوہ کر دیا
ایک لغزش زندگی بھر کی عبادت کھا گئی

ابھی آنکھوں کی شمعیں جل رہی ہیں پیار زندہ ہے
ابھی مایوس مت ہونا ابھی بیمار زندہ ہے

اب کے موسم میں مرے چاہنے والوں کی قسم
اتنا پتھر مرے سر پر کبھی برسا ہی نہیں

نیم ہمارے گھر کی شوبھا، جامن سے بچپن کا رشتہ
ہم کیا جانیں کس رنگت کا ہوتا ہے بادام کا پیڑ

جہاں ہے پیار وہیں رنجشیں بھی دیکھو گے
جہاں غرض ہے وہاں دوستی زیادہ ہے

جو دعائیں دے رہے تھے وہ مخالف ہو گئے
میری شہرت میرے یاروں کو بڑی مہنگی پڑی

عطا ہوئی ہے مجھے دن کے ساتھ شب بھی مگر
چراغ شب میں جلا دیتا ہے ہنر میرا

تو میرے پاس تھا یا تیری پرانی یادیں
کوئی ایک شعر بھی تنہا نہیں لکھا میں نے

سوتے ہیں بہت چین سے وہ جنگلے گھروں میں
مٹی کے علاوہ کوئی برتن نہ ملے گا

مری خواہش کا کوئی گھر خدا معلوم کب ہوگا
ابھی تو ذہن کے پردے پہ بس نقشہ بناتا ہوں

جو مذہب اوڑھ کر بازار نکلیں
ہمیشہ ان اداکاروں سے بچنا

خواب ٹوٹے جاتے ہیں، دل شکست کھاتا ہے
بے سبب کوئی پاگل دیر تک نہیں رہتا

خفا تو دونوں ہی ایک دوسرے سے تھے لیکن
ندامت اس کو بھی تھی شرمسار میں بھی تھا

اے دوست ہر قدم پہ مناظر اجل کے دیکھ
اک روز میرے ساتھ سفر پر نکل کے دیکھ

جل کے گھر خاک ہوئے ہو گئی مدت لیکن
آج بھی شمع جلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

چاندنی میں رات بھر سارا جہاں اچھا لگا
دھوپ جب پھیلی تو اپنا ہی مکاں اچھا لگا

بات کا زخم عجب زخم ہے جس کا انورؔ
درد گھٹ جائے مگر زخم تو بھرتا ہی نہیں

بشکریہ Rays of Thought، سرفراز نواز

❑❑❑

انس مسرورانصاری
سکراول،اردو بازار،ٹانڈہ،امبیڈکرنگر
موبائل: 9453347784

کتاب دل کے ورق سے

امیرِ شہرِ سخن ،جانِ رنگ و بوئے چمن
تمہاری یاد میں ہے ا شکبار چشم وطن

سفیرِ امن و سکوں، رہنمائے شعر وادب
یقین جانو،تمھیں ہم بھلا سکیں گے کب

حدیثِ دیدہ ودل یو ں سنا گئے ہو تم
جدا ہوئے ہو تو سب کو رلا گئے ہو تم

تمہارے علم و فضیلت کی یاد آتی ہے
خلوص و پیار و محبت کی یاد آتی ہے

سلگتی ریت پہ اک سائبا ن تھے گویا
ہمارے سر پہ شفیق آسمان تھے گویا

جو زندگی کے کسی موڑ پر بھی ملتے تھے
ہمارے باغِ دل و جاں میں پھول کھلتے تھے

حقیقتوں کو زما نے پہ آشکار کیا
خزاں کو غازۂ دوشیزۂ بہار کیا

وطن سے ٹوٹ کے تم نے کچھ ایسے پیار کیا
کہ خار وخس کو بھی خوشبو کا رشتے دار کیا

فروغِ اردو زباں کا جو تم نے کام کیا
تو شہرتوں نے بھی جھک کر تمہیں سلام کیا

دکھا یا گیتا و قرآں کا آئینہ تم نے
کہ سب کا ایک ہے خالق، بتادیا تم نے

تمہارے کام کو دنیا سراہتی ہے آج
کیا جو تم نے وہی کام چاہتی ہے آج

یہ کام وہ ہے دلوں کوجو جوڑ دیتا ہے
فسوں طرازی تعصب کی توڑ دیتا ہے

پیمبروں کی زمیں تم پہ ناز کرتی ہے
سخنوروں کی زمیں تم پہ ناز کرتی ہے

وطن کو فخر ہے تم پر کہ جاں نثار تھے تم
خزاں کے دوش پہ آئینۂ بہار تھے تم

قیامِ امن واہنسا کی کوششیں تھیں مدام
تمہارے جذ بۂ انسانیت کو لاکھوں سلام

اُ ڑائی کس نے یہ افواہ مر گئے انورؔ
حدودِ وہم و گماں سے گزر گئے انورؔ

اُسے خبر ہی نہیں ہے جو ایسا کہتا ہو
ہمارے جذبۂ سوزِ دروں میں زندہ ہو

تمہارے جسم کو د فنا کے آگئی دنیا
زمیں کے نیچے اگرچہ سلا گئی دنیا

تمہارا جسم نہیں ہے تو کیا ہوا انورؔ
دلوں میں روح ہے اب بھی غزل سرا انورؔ

مجھے یقین ہے انورؔ کہ مرنہیں سکتے
حدودِ وقت سے آگے گزر نہیں سکتے

تمہارے لفظ و بیاں گونجتے ہیں کا نوں میں
ابھی تو زندہ رہو گے کئی زمانوں میں

تمہاری یاد کی خوشبو تمہارا حسنِ عمل
غزل کی طرح شگفتہ،کنول کی طرح سجل

کتابِ دل کے ورق آنسوؤں سے نم نہ کرو
ہمارے پاس ہو تم دوریوں کے غم نہ کرو

خدائے پاک سے کرتے ہیں مغفرت کی دعا
تمہاری قبر پہ رحمت کی بارشیں ہوں سدا

تمہارے قرب کی لذت کو دل میں پاتے ہیں
کوئی دن اور کہ ہم تم سے ملنے آتے ہیں

تعلیم و تربیت اطفال

مرزا جعفر حسین

۱۸۹۹ء ۱۹۸۹ء

’نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر‘

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

’دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک‘

اسی کے پیش نظر ’نیا دور‘ کے ہر شمارے میں ’گزشتہ لکھنؤ‘ کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی چودھویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین** کی کتاب **’قدیم لکھنؤ کی آخری بہار‘** سے ایک تحریر **’تعلیم و تربیت اطفال، حصہ دوم‘** حاضر ہے۔ ’نیا دور‘ ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

والد مرحوم کا طرزِ تربیت بالکل مختلف انداز کا تھا۔ وہ طویل گفتگو یوں بھی نہیں فرماتے تھے۔ دوستوں کے مجمع میں یا مقربین کی صحبت میں بھی خود بہت کم بات کرتے تھے۔ زیادہ تر دوسروں کو مخاطب کر کے باہم دگر سوال و جواب پر آمادہ کر دیتے تھے اور خود مسکرا مسکرا کر دوسروں کی باتیں سنا کرتے تھے۔ وہ کسی قدر مغلوب الغضب بھی تھے لیکن جب غصہ آ جاتا تو دو کلمے زور سے کہہ کر یک لخت سکوت اختار کر لیتے۔ میرے ساتھ زندگی بھر یہ طرزِ عمل رہا کہ کوئی بات خلاف مزاج ہوتی تو ایک خشن آواز میں ’ہوں‘ کہہ کر گہری سانس لیتے اور خاموش ہو جاتے تھے۔ میرے عہد طفولیت میں جب کھلائی ان کے حضور بٹھا کر ہٹ جاتی تو وہ یہ چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ دیر تک ان کی آنکھوں سے سامنے بیٹھا رہوں۔ میری تسلی کے لئے کبھی کوئی تصویر مرحمت فرماتے، کبھی کوئی کھلونا عنایت کرتے اور کبھی تو وہ خود بچوں کی طرح میرے ساتھ کھیلنے لگتے تھے۔ مردانہ نشست گاہ میں میرے دوران قیام وہ میرے اوپر سر سے پاؤں تک نگاہ رکھتے تھے۔ پوشاک یا اعضاء و جوارح کی صفائی میں کوئی نقص ہوتا تو ملازمہ کے بجائے مجھ پر اعتراض وارد کرتے تھے لیکن اس اعتراض میں الفت و رافت جھلکتی تھی۔ مجھے دوسروں سے بات کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتے تھے اور دوسروں سے یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ مجھ سے گفتگو کریں۔ اس بات چیت میں کبھی زبان و بیان میں اعتراض ہوتا تو کبھی واقعات کو صحت کے ساتھ پیش کرنے کا طرز سیکھا تھا۔ ان نشستوں میں ان کے خدمت گار اور مخصوص ملازمین وقتاً فوقتاً حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا حکم دے دیتے تھے کہ ملازم کو مجھ سے یا مجھے ملازم سے بات کرنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی تھی۔ نوکر کو تخاطب کرنے میں میرے لئے ’آپ‘ کہنا ضروری تھا۔ محل کے اندر بعض کنیزوں سے تم کہہ کر بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اگر بھولے سے کبھی کسی ملازم کو ان کے حضور تم کہتا تو وہ خفا ہو جاتے اور مجھے اس ملازم سے معذرت کرنا پڑتی تھی۔ میری معذرت خواہی پر وہ خوش ہو جاتے اور بڑی شفقت سے یہ فرماتے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ بچوں کو ڈانٹنے اور ان پر خفا ہونے کو وہ بہت برا سمجھتے تھے۔ کسی دوسرے کے بچے کی باہر سے رونے کی آواز آ جاتی تو بے قرار ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی گھبرا کے خود ہی نشست گاہ سے باہر آ کر رلانے والے پر برہم ہو جاتے تھے۔ بچہ کو مار دینا ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا لیکن تمام عمر میں انہوں نے مجھے میرے عہد طفولیت میں صرف ایک بار ایک تھپڑ مار دیا تھا اور یہ واقعہ مجھے تا حیات یاد رہے گا۔

اس واقعہ کو پیش کرنے کے قبل یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ والد مرحوم نے بہت طویل عمر پا کر ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا تھا۔ اس وقت میری عمر اڑتیس برس کی تھی لیکن اس ایک واقعہ کے علاوہ میری کسی انتہائی خلاف مزاج حرکت پر بھی جو بکثرت سرزد ہوتی تھیں، انہوں نے کبھی کسی شدید برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ غیر معمولی کٹر قسم کے مذہبی انسان تھے اور میں انگریزی

تعلیم حاصل کر کے ان کے نزدیک لامذہب اور بے دین ہو چکا تھا۔ اس صورت حال سے ان کو میری ذات سے بہت صدمہ رہا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں کے کسی مخالف نے ان کو روحانی ایذا پہنچانے کے لئے یہ خبر سنا دی کہ میں نے مئے نوشی اختیار کر لی ہے۔ انہوں نے اس شخص کو یہ جواب دیا کہ میں بالغ و عاقل تھا لہٰذا اپنے افعال کا خدا کو خود جواب دہ تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق تھا وہ امور شرعیہ کی تعلیم دلوا کر بری الذمہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس شخص کو یہ جواب تو دے دیا تھا لیکن وہ خبر ان کے دل و دماغ میں کانٹے کی طرح کھٹکا کرتی تھی۔ کچھ مدت کے بعد انہوں نے یکا یک مجھ سے باز پرس کر ڈالی اور خبر کی صحت و عدم صحت کے بارے میں براہ راست سوال کر لیا۔ میں اسی سال وکالت کے پیشہ میں داخل ہوا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ 'قبلہ! یہ سوال آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ اگر میں شراب پیتا ہوں اور جواب اثبات میں دیتا ہوں تو آپ کو سخت صدمہ ہوگا اور اگر نہیں کہتا ہوں تو جھوٹ بولنے کے گناہ کی سزا کا مستوجب ہوں گا۔'

انہوں نے میرے اس جواب پر 'ہوں' کہہ کر بہت گہری سانس لی اور خاموش ہو گئے۔ ان کے ایک حاضر الوقت دوست نے جن کو میں چچا کہتا تھا، خفگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے بدتہذیب قرار دیا۔ میں نے مؤدبانہ جواب دیا کہ جھوٹ بولنے کے مقابلہ بدرجہا بدتہذیبی بہتر ہے اور جھوٹ بولنے سے اجتناب جناب محترم کی تعلیم ہی کا اثر ہے۔ ان کو زیر نظر واقعہ نہیں معلوم تھا لیکن میرے پیشرو وہی تھپڑ تھا جو زندگی میں ایک بار ان کے ہاتھوں مجھ پر پڑا تھا۔

یہ واقعہ اس زمانہ سے متعلق تھا جب میں عربی مدرسہ کا طالب علم تھا اور میری عمر آٹھ برس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ والد مرحوم کو بہترین قلم سے لکھنے کا ذوق تھا اور وہ اپنے قلم بڑی محنت و کاوش سے خریدتے تھے۔ اس زمانہ میں ان قلموں کو 'کلک' کہتے تھے اور بہترین کلک کی چوک میں زیادہ سے زیادہ دکانیں لگتی تھیں۔ یہ کلک گراں بھی ہوتے تھے یعنی یہ کہ ایک ایک قلم کئی پیسے کا ہوتا تھا۔ کلک بہت مضبوط، خوش رنگ اور خوشبودار ہوتا تھا۔ بنانے والے بڑی محنت سے بناتے تھے۔ والد مرحوم کو یہ قلم اتنے عزیز ہوتے تھے کہ وہ کسی کو چھونے تک نہیں دیتے تھے۔ میں نے کمسنی کی جہالت میں ان کے قلمدان سے ایک قلم بغیر ان کی اجازت اور اطلاع

سے نکال لیا اور برابر اسی سے لکھنے لگا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک روز ان کی نظر پڑ گئی۔ والدہ مرحومہ کی طرح وہ بھی خبر گیری کے لئے ہمارے کمرے میں کبھی کبھی آجاتے تھے۔ انہوں نے مجھے کلک سے لکھتے ہوئے دیکھا اور بے تابانہ قریب آکر دریافت کیا کہ یہ قلم کہاں سے لائے۔ مجھے قطعاً نہیں معلوم تھا کہ کلک کمیاب تھا۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ اسکول سے واپسی پر خریدا تھا۔ انہوں نے غصہ ضبط کر کے دوسرا سوال کیا کہ کہاں سے خریدا؟ میں نے ایک فرضی دکاندار کا نام بھی بتا دیا۔ اب انہوں نے تیسرا سوال کیا کتنے کو خریدا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ وہ قلم قیمتی ہوتا تھا اس لئے برجستہ کہہ دیا کہ ایک پیسہ کو۔ اب ان کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے ایک تھپڑ مارا اور فرمایا کہ 'چوری کرتا ہے اور جھوٹ بھی بولتا ہے۔' گھر میں یہ واقعہ ایک سانحۂ عظیم کی حیثیت رکھتا تھا۔ والدہ مرحومہ بہت روئیں، میری انا نے کئی وقت کھانا نہیں کھایا، والد مرحوم کے حضور ایک مدت تک نہ میں گیا اور نہ وہ خود میرے کمرے میں آئے۔ جہاں تک میرے تاثرات کا خیال ہے آج تک میں جھوٹ بولنے کو سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور وکالت کے پیشہ میں داخل ہونے کے بعد بھی حتیٰ المقدور اس گناہ سے احتراز کرتا رہا تھا۔

اس گرانقدر تربیت کے ساتھ ساتھ دستورِ زمانہ کے مطابق لڑکیوں اور لڑکوں کو پڑھوایا بھی جاتا تھا۔ لڑکیاں محل میں متعین مستقل استانی کے سپرد کر دی جاتی تھیں جو ان کو بڑی محنت و جانفشانی سے پڑھاتی تھیں اور لڑکیاں بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتی تھیں لیکن لڑکوں کی پڑھائی میں بڑی سست رفتاری ہوتی تھی۔ مدرسوں یا مکتبوں میں لڑکوں کو بھیجنا ناپسند تھا۔ محل کا تمام بیرونی ماحول رئیسانہ اور شاہانہ ہوتا تھا۔ پڑھانے والے بھی آرام طلبی میں وقت ضائع کرتے تھے۔ ان حالات میں لڑکوں کی بہت اچھی تعلیم ممکن ہی نہیں تھی حالانکہ بسم اللہ کی رسم ادا ہونے کے قبل ہی سے ایک مولوی اور ایک مدرس ملازم رکھ لئے جاتے تھے۔ مولوی دوسرے ہی دن سے بغدادی قاعدہ پڑھانا شروع کر دیتا تھا۔ بغدادی قاعدہ اس لئے پہلے پڑھایا جاتا تھا کہ بچہ عربی حروف و الفاظ سے مانوس ہو کر قرآن مجید پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ اردو پڑھانے کا سلسلہ بھی اسی وقت شروع ہوتا تھا جس پر مولوی سے زیادہ گھر کی استانی توجہ کرتی تھی۔

اردو پر گھر کے ماحول کی بدولت مہارت ہو جاتی تھی۔ سلیس زبان بولنا اور اردو کے محاورات پر قابو پانا تربیت ہی کی برکتوں سے آجاتا تھا۔ بیگمات سے بہتر کوئی مولوی یا مدرس اردو پر قادر نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے بچوں کو یہ دولت بغیر کسی زحمت کے مل جاتی تھی۔ مدرس آمد نامہ اور خالق باری پڑھانے پر پہلے توجہ کرتا تھا۔ اس کے بعد گلزار دبستان اور گلستاں پھر بوستاں پڑھاتا تھا۔ اسی تعلیم میں برسوں صرف ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف مولوی صاحب قرآن مجید کے کچھ پارے اور دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد صرف میر پھر نحو میر پڑھاتے تھے۔ صرف ونحو کی اس ابتدائی تعلیم کے بعد پنج گنج بھی کسی نہ کسی طرح رٹا کے تعلیم کا سلسلہ ختم کرادیا جاتا تھا۔ یہ بھی مشہور ہو جاتا تھا کہ قرآن ختم کرادیا گیا اور اس ختم قرآن کی خوشی میں دعوتیں ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ لڑکا چودہ پندرہ برس کی عمر تک صرف اتنی ہی تعلیم پاکر فارغ التحصیل ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد نوجوان جو کچھ علم حاصل کرتے یا فنون میں کمال دکھاتے وہ صرف اپنے ہی ذوق وشوق یا والدین کے رغبت دلانے کا نتیجہ ہوتا تھا۔ ایسے طالبان علم میں بھی بڑے بڑے ذی وقار موجود تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک صف اول کے رؤسا میں نواب آغا ابو صاحب مرحوم کی ذات گرامی فقہ اور اصول میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

درسیات کی اس نامکمل اور ناقص تعلیم کے باوصف دو علوم ایسے تھے جن کی طرف رؤسا وعمائدین کو بڑی رغبت تھی جن میں ایک علم طب اور دوسرا علم عروض تھا۔ معاشرہ شعر وادب میں سرشار تھا۔ ہر رئیس اپنے کو باکمال شاعر سمجھتا تھا اور اپنے اس مفروضہ کمال کو ثابت کرنے کے بعض رئیسوں کو ضرورت بھی محسوس ہوتی تھی۔ ہر رئیس کے دربار سے دو اور بعض کے یہاں زیادہ شعراء متعلق رہتے تھے۔ انہیں شعراء کی بدولت کسی کو کم اور کسی کو زیادہ عروض سے واقفیت حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ کمی اور بیشی اپنے اپنے شوق پر منحصر ہوتی تھی۔ اس لئے رؤسا کو عروض میں واقفیت حاصل کرنے کے لئے زحمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جب ذاتی شوق کو آسودگی فراہم کرنے کا سوال آجائے تو زحمت بھی آسان ہو جاتی تھی۔ اسی طرح علم طب سے بھی بڑا ذوق تھا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ علم طب کا کسی نہ کسی حد تک حاصل کرنا اس زمانے کے فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ بعض اطباء یقیناً اچھے شاعر بھی تھے لیکن ہر شاعر علم طب میں بھی کچھ نہ کچھ دخل رکھتا تھا۔ شرفاء عام طور سے طبابت کا پیشہ پسند کرتے تھے اور رؤسا طب کو برائے طب حاصل کرتے تھے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خانوادہ خان علامہ کی

ہر فرد جو بالغ وفرزانہ تھی علم طب سے باخبر تھی اور طبابت نہ کرنے پر بھی اپنے نام کے پہلے لفظ حکیم کا استعمال اپنے لئے باعث مفاخرت سمجھتی تھی۔ اس علم کے حصول سے بہرحال اتنا فائدہ ضرور تھا کہ اپنے محل کے معالجات میں رؤسا کو دلچسپی رہتی تھی اور اپنے خاندانی طبیب سے عند الضرورت تبادلۂ خیالات کر لیتے تھے جس کے نتائج سودمند ہی ہوتے تھے۔

ان علوم کے علاوہ بعض فنون میں بھی رؤسا کو دلچسپی تھی۔ ان کو بڑے ذوق وشوق سے سیکھتے اور ماہرین کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ موسیقی کا ذوق سب کو تھا اور کسی نہ کسی طرح اس فن کی نزاکتوں میں کچھ نہ کچھ درک بھی حاصل کر لیتے تھے لیکن عملاً موسیقی میں درس کبھی کسی رئیس نے نہیں لیا۔ راقم کے مورث اعلیٰ رات بھر کتب بینی کرتے یا تصنیف و تالیف میں شب بیداری فرماتے تھے۔ بعد نماز صبح بھیرویں سن کر آرام فرماتے تھے لیکن باوجود راگ اور راگنیوں پر پوری علمی واقفیت کے خان علامہ نے کبھی خود کوئی مشق نہیں کی۔ خطاطی کے فن میں ان کے اخلاف نے بڑے بڑے صاحب کمال استادوں کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ خان علامہ خود بھی خط نسخ ونستعلیق میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سعادت علی خاں نے یہ فن انہیں سے سیکھا تھا۔ خطاطی کا شوق بہت سے رؤسا کو تھا اور بیسویں صدی کے اوائل تک متعدد بزرگ اس فن کے ماہر تھے۔ مصوری کا ذوق بھی ہر رئیس کو تھا لیکن عملاً یہ شوق دو چار بزرگوں ہی کو ہوا۔ ان فنون کے علاوہ بنّوٹ کی طرف بھی بعض رئیسوں کی توجہ ہوئی تھی اور انہوں نے باکمال فنکاروں کی شاگردی قبول فرمائی تھی۔ بہرحال یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ علوم وفنون سے ہمارے رؤسا کو شغف تھا لیکن یہ ذوق انفرادی طور پر سن شعور آجانے کے بعد پورا کیا جاتا تھا۔ ان فنون کے سیکھنے میں بزرگوں کی ہدایت یا سرپرستی کو بہت کم دخل ہوتا تھا اور نہ ایسا ہوتا تھا کہ کوئی رئیس اپنے بزرگوں کی ایسے ذوق وشوق میں تقلید یا تاسی کرے۔ اس صورت حال سے یہ نتیجہ پورے وثوق کے ساتھ نکالا جاسکتا ہے کہ مفروضہ طور پر فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہر رئیس کا رجحان اپنے ذاتی ماحول کے تحت کسی نہ کسی علم یا فن کی طرف مبذول ہو جاتا تھا۔ صرف علم طب اور علم عروض ہی کی مقبولیت میں ہمہ گیری تھی اور فنون میں خطاطی کو بڑے طبقہ میں شرف قبول حاصل تھا۔

❑❑❑

اس کے سورج چاند ستارے

چھما شرما

17B1، ہندوستان ٹائمس اپارٹمنٹ، میوروہار،
فیز-1، دہلی موبائل: 9818258822

اس کی ننھی انگلیاں ٹیبلیٹ پر کسی مشاق رقاصہ کی طرح تھرکتے ہوئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی تھیں۔ کبھی پہلی انگلی آگے نکل جاتی تھی تو کبھی دوسری انگلی اسے پچھاڑ دیتی ہے۔

انہیں انگلیوں کے سہارے تو اس نے چاند اور تاروں کو اپنی الماری، فرج اور صوفے پر چپکا دیا تھا۔ یہ چاند ستارے اس کی بوا نے منگائے تھے۔ وہ انہیں کتاب سے پھاڑ کر جگہ جگہ چپکا دیتا تھا۔ رات میں دادا جی جب اٹھے تو لگا جیسے کمرے میں روشنی ہے۔ لائٹ تو بند تھی مگر کمرے کی الماری پر چپکائے اس کے ستارے روشنی بکھیر رہے تھے۔ وہ اندھیری رات میں چمکتے تھے۔ ان کے پیچھے پوشیدہ اس کا چہرہ اور ٹمٹماتی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ چاند ستاروں کو ٹمٹماتے مہینوں گزر گئے۔ اسے گئے بھی کتنے دن ہو گئے لیکن لگتا ہی نہیں کہ وہ جا چکا ہے۔ اب بھی اس کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ لگتا ہے، بس یہیں، یہیں کہیں!

'آر یو مسنگ می بوا؟' اپنے گھر پہنچنے کے بعد اس نے اسکائپ پر پوچھا تھا۔

بوا نے اس کی اداسی دور کرنے کے لئے بہلانے کو کہہ دیا 'ہاں! میں تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ ابھی میں پودوں کو پانی دے رہی تھی تو بہت یاد آئے۔ یاد ہے، ہم دونوں مل کر پودوں کو پانی دیتے تھے۔ تو پودوں کی پتیوں کو چھوتا تھا، پھول توڑنے کی کوشش کرتا تھا، میں منع کرتی تھی۔ ایک دن تو نے گلاب توڑ کر ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا اور تو کتنی زور سے ہنسا تھا۔ تیری چالاکی پکڑی گئی تھی نا، شیطان کہیں کا۔ وہی پودے اب تجھے بہت یاد کر رہے ہیں۔ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا بے بی کب آئے گا؟ کیا اسے ہماری یاد نہیں آتی؟'

'کیا تم نے انہیں بتا دیا کہ میں چلا گیا؟ رو رو ہے تھے میری یاد میں؟ مگر بوا! انہیں کیا بتایا، میری بات کرا دو ان سے۔' اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

> چھما شرما ہندی زبان کی مشہور افسانہ نگار۔ افسانوں اور مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ بھارتیندر ہرشچند راعزاز سے سرفراز اور ہندی اکادمی، دہلی سے تین مرتبہ انعام سے سرفراز۔ ریڈیو اور ٹی وی چینلوں پر بچوں کے لئے اسکرپٹ رائٹنگ بھی کرتی ہیں۔ پیش ہے ان کی کہانی **'اس کے سورج چاند ستارے'** جس کا اردو ترجمہ **'مناظر حسین'** نے کیا ہے۔

اب کیا کرتی بوا؟ پودوں سے اس کی باتیں کیسے کرائے۔ اس نے اس کی بات ٹال کر کہا۔ 'ہر روز جب میں پانی دینے جاتی تھی تو تیرے بارے میں پوچھتے تھے، میں بہانا بنا دیتی تھی کہ یہیں ہے، جلد ہی ملنے آئے گا۔ ایک دن تو سب کے سب سسکیاں بھرنے لگے، کہنے لگے، بلاؤ، ابھی بلاؤ ہمارے بے بی کو۔ تب میں نے ان سے کہا تھا کہ سچی بات بتاؤں تو روئیں گے تو نہیں؟ انہوں نے وعدہ کیا کہ نہیں روئیں گے۔ تب میں نے انہیں بتا دیا کہ ہمارا بے بی تو بہت دور چلا گیا۔ اب تو بہت دن بعد آئے گا۔ پودے روئیں گے تو آخر انہیں چپ کون کرائے گا۔ ان کے تو ممی پاپا بھی یہاں نہیں رہتے۔ پھر پتہ چل گیا کہ تم بھی چلے گئے تو ان کو کتنا دکھ ہوگا۔ اس لئے میں نے ان سے عہد لے لیا کہ وہ روئیں گے نہیں۔' بوا نے اسے سمجھایا۔

لیکن ان کے ممی پاپا کہاں چلے گئے؟ کس کے ساتھ رہتے ہیں، وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟ انہیں اپنے پودوں کی یاد نہیں آتی؟ میرے ممی پاپا تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتے۔' اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈائناسور کی پونچھ مروڑتے ہوئے کہا۔

اب بوا کیا جواب دے؟ کیسے بتائے کہ پودوں کے ممی پاپا کہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی اس کے ہزاروں سوالوں میں کن کن سوالوں کا جواب دے سکتی ہے۔ کئی بار تو اس کے سوالوں کے جواب تو کسی کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ اس لئے ان سوالوں کو بھلانے کے لئے اسے کسی دوسری بات میں الجھا دیا جاتا ہے۔ وہ ادھر سے چلا رہا تھا، 'بتاؤ بوا، بتاتی کیوں نہیں؟' بوا بہت دیر چپ رہی اور پھر کچھ دیر بعد سوچ کر بولی:

'جیسے کہ دادا دادی تمہارے پاس نہیں رہتے یا تم دادا دادی کے پاس، ویسے ہی پودوں کے ممی پاپا ان کے پاس نہیں رہتے۔'

'بٹ آئی لو مائی دادا جی اور دادی۔ میں تو روز

ان سے باتیں کرتا ہوں۔ کیا پودے بھی اپنے ممی پاپا سے روز اسکائپ پر باتیں کرتے ہیں، انہیں پیار کرتے ہیں،' اس نے پوچھا۔

دو دن پہلے ہی تو اس نے یہاں بوا کی سالگرہ منائی تھی۔ اسی خوشی میں پورے گھر میں دھما چوکڑی مچا تا رہا تھا۔ گانوں پر ڈانس کر رہا تھا۔ اس کے ڈانس کا دادی نے ویڈیو بنایا تھا۔ بوا نے اپنے یوم پیدائش کے لئے جو کیک آن لائن آرڈر کیا تھا اس پر اسی کا نام لکھوایا تھا جیسے اسی کا برتھ ڈے ہو۔ اسی نے کیک کاٹا تھا اور خود ہی دیر تک تالیاں بجا تا رہا تھا۔

حالانکہ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ 'اس سے کیک مت کٹوائیے۔ دوسرے بچوں کی سالگرہ میں شرکت پر وہاں بھی سمجھتا ہے کہ اسی کا برتھ ڈے ہے، اسے ہی کیک کاٹنا ہے۔ ایک دو بار تو جس بچے کی سالگرہ تھی اسے ہی کیک نہیں کاٹنے دیا۔ بضد ہو گیا کہ کیک یہی کاٹے گا۔ بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔'

اس کے بعد دادی نے کہا تھا۔ 'ارے آج تو اسے ہی کاٹ لینے دو، دل ٹوٹ جائے گا بیچارے کا۔ بڑا ہونے پر سب سیکھ جائے گا۔ ابھی سے سب کچھ بڑوں کی طرح کرنے لگے گا تو بچہ کس بات کا؟'

'لیکن اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ہر روز اپنا برتھ ڈے نہیں منا سکتا۔' اس کی ماں نے ناراضگی سے کہا۔

دیوار پر لٹکی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اس کی آواز پورے گھر میں سنائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف لٹکے ہوئے کپڑوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں بھی انہیں گھنٹیوں کی آواز پر اچھل کود میں مصروف تھیں۔ وہ کیک کاٹ رہا تھا اور گا بھی رہا تھا 'ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیئر بوا' دوڑ دوڑ کر سب کے منہ پہ کیک لگا رہا تھا۔ کوئی کھانے سے منع کرے تو ناراض ہو جائے۔ دادا دادی، بوا، اس کے ممی پاپا سب اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

دادا دادی اور بوا سب یہ نہیں سوچنا چاہتے تھے کہ کل اس وقت تک وہ کہیں سے کہیں اڑ کر چلا گیا ہوگا۔ جس دن اسے آنا تھا، لگتا تھا کہ یہ رات جلدی کیوں نہیں کٹتی اور آج ایسا لگ رہا تھا کہ یہ رات کبھی ختم ہی نہ ہو۔ وہ کبھی یہاں سے نہ جائے۔ وہ اسی طرح ہنستا کھلکھلاتا، آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔

سویرے جب سورج کی کرنیں بھی نہیں پھوٹی تھیں، آسمان کی ہلکی سرخی اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہ صبح ہونے کو ہے، تبھی وہ ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ چلا گیا۔ کوئی اس کے سامنے نہیں رویا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی سے رونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ یہ بہت روتا ہے اور پھر بخار آجاتا ہے۔ وہ بیمار نہ پڑ جائے اس لئے روانگی کے وقت دادی نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ کہیں وہ دیکھ نہ لے کہ دادی کی آنکھیں نم ہیں۔ بوا نے بھی منہ پھیر لیا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ابھی بھی آنکھ ملتا ہوا اٹھا تھا۔ باتھ روم میں گیا تھا، برش کیا تھا، ناشتہ کیا، سب کو پیار کرتا ہوا سیڑھیوں سے اترا تھا۔ پارک کی گھاس پر اب بھی اس کے پاؤں کی خوشبو موجود ہوگی۔ جن سڑکوں سے گزرا ہوگا وہاں بھی یادوں کی کچھ نہ کچھ علامت ضرور موجود ہوگی۔ ائیر پورٹ جیسے اب بھی ننھے پاؤں کی آہٹ سے بھرا ہوگا اور کچھ ہی دیر میں دیکھتے دیکھتے وہ ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔

وہ چلا گیا ہے، احساس ہی نہیں ہوتا۔ لگتا ہے، عقب کے کمرے میں نیند کے دوران کوئی خواب دیکھ رہا ہے یا اسی چاند کے ساتھ اڑا جا رہا ہے جسے وہ اپنے بیگ میں ٹیبلیٹ کے ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔

دو دن سے وہ سوال در سوال پوچھ رہا تھا۔ آپ سب چلیں گے نا میرے ساتھ۔ آخر کوئی تو اسے یقین دلائے کہ سب اس کے ساتھ چلیں گے۔ پھر اس کے پاپا نے سمجھایا تھا کہ ساتھ تو نہیں چلیں گے لیکن بعد میں ضرور آئیں گے۔

تب اس نے بھیگے گلے سے پوچھا تھا، 'میری بوا بھی؟'

'ہاں، بوا بھی۔' اس کی ماں نے جواب دیا۔

لیکن اسے یقین نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے رو رہا تھا۔ کبھی سبزی میں مرچ کی زیادتی پر تو کبھی ٹیبلیٹ میں گیم بدلنے پر۔ اس کی آنکھیں مسلسل نم تھیں۔

'تو تو ہی رک جاناں یہاں؟' دادی نے اسے بہلانے کے لئے کہا تھا۔

'مگر مجھے اسکول جانا ہے، وہاں میرے دوست ہیں۔ میرا گھر بھی میرے بغیر کتنا اداس ہوگا۔ مجھے سوئمنگ، تائیکوانڈو اور پیانو سیکھنے بھی تو جانا ہے۔' اپنے جانے کی ہزار وجوہات گنا کر وہ دل کو سمجھا رہا تھا۔

'مگر یہ بھی تو تیرا گھر ہے؟'

'نہیں، یہ تو آپ کا گھر ہے۔'

'مگر ہم بھی تو تیرے ہیں۔' دادی نے اسے بہلایا۔

جب اسے لگا کہ کوئی اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتا پھر وہ خود میں کھو گیا۔ باتیں بند کر دیں۔ باتیں کرتا تو آنکھ نہ ملاتا اور مسکرانا تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔

اس کی ماں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ 'اسے یہاں سب کا اٹینشن مل رہا ہے نا؟ لگ رہا ہے کہ جو اسے ڈانٹتے ہیں، انہیں بھی کوئی ڈانٹ سکتا ہے۔ دیکھا نہیں، کیسے آپ سب سے ہماری شکایتیں کرتا ہے۔ وہاں تو بیچارہ ڈانٹا بھی جاتا ہے۔'

'اسے ڈانٹنے کا کیا مطلب؟' دادا جی نے غصے سے کہا۔

'اب ہر وقت سوالات پوچھ پوچھ کر جان کھا جاتا ہے۔ اس کے پاس باتنے کو بہت گیان ہے۔ کان پک جاتے ہیں۔ اسی لئے ایک بار کہہ دیا کہ زیادہ

بولو گے تو زبان نیچے گر پڑے گی۔ اسی لئے جب زیادہ بولتا ہے تو اشارہ کرتے ہی چپ ہو جاتا ہے کہ کہیں زبان نہ گر پڑے۔ آج کل کانوں کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے کہ کہیں کان بھی تو غائب نہیں ہو جائیں گے۔' اس کی ماں نے کہا۔

'اس طرح ڈراؤ گے تو ڈر بیٹھ جائے گا اس کے دل میں، اور سوال پوچھنے سے کیوں روکتے ہو؟ سوال پوچھنا اچھا ہے۔ کم سے کم یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے اندر کیا چل رہا ہے۔'

اس نے دادا کے لئے اک کارڈ بنایا تھا 'گیٹ ویل سون' اس میں سفید کاغذ پر لال قلم سے دو تصاویر تھیں چھوٹی چھوٹی۔ ایک کے چشمہ لگا تھا اور مفلر بھی پہنے تھے یعنی دادا جی۔ دوسرا وہ خود تھا۔ ان کے اوپر ایک چھاتا سا بھی لگا تھا۔ ماں نے پوچھا تھا، 'یہ کیا ہے؟'

'ڈریگن'

'لیکن ڈریگن کیوں؟'

'دادا جی کی حفاظت کے لئے'

'اور تمہاری حفاظت کون کرے گا؟' پاپا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

میرے ساتھ میں تو دادا جی ہیں۔ دادا جی کے ساتھ کوئی نہیں ہے یعنی کہ حفاظت کے لئے کوئی بڑا ہونا چاہئے۔

ٹیبلیٹ کے کی بورڈ پر طوفان کی رفتار سے بھاگتی ہوئی اس کی انگلیاں۔ وہ اپنا من پسند کارٹون ڈاؤنلوڈ کر لیتا۔ کچھ اچھا لگتا تو ٹائپ کر کے ممی پاپا اور بوا کو میسج کرتا۔

مٹی کے کھلونے، کپڑے کے، پلاسٹک کے یا چابی سے چلنے والے، ان کا تو شاید اس نے نام بھی نہ سنا ہوگا۔

اس کے پاپا کہہ رہے تھے۔ 'نو، نو، میں تمہیں اپنا پاسورڈ نہیں بتاؤں گا۔'

مگر اسے معلوم ہے۔ کل اس نے پوچھا تھا کہ اس کا پاسورڈ بتاؤ۔ جب میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تو اس نے فوراً پاسورڈ ٹائپ کر کے کہا۔ 'دیکھو'

'ارے وہ اس کی ماں کا۔ وہ بھی کیسے پتہ چلا کہ ایک دن اس کی ماں نے اپنی ممی کو زور سے بول کر اپنا پاسورڈ بتایا تھا اور اسے یاد ہو گیا۔' اس کے پاپا نے کہا۔'

'ایک ہی بار میں یاد ہو گیا؟' دادی نے تعجب سے کہا۔

'ہاں، صرف یہی نہیں، اسے سب چیزیں یاد ہو جاتی ہیں بلکہ اگر ہم کچھ بھول جائیں تو ہمیں بھی یاد دلاتا ہے۔' اس کی ماں بتا رہی تھی۔

چھ سال کا بچہ، اس کے معصوم سوالوں پر تکنیک نے قبضہ جما لیا ہے۔ وہ ان میں اپنا حل تلاش کر رہا ہے۔ پل پل کبھی کسی چیز کو ڈاؤنلوڈ کر رہا ہے۔ کسی کو کوئی کہانی کاپی پیسٹ کر کے میسج کر رہا ہے۔ اس کی زندگی میں کہانی سنانے کے فن کی جگہ تکنیک کی اس نئی دنیا نے گھیر لی ہے۔

اس کے پاس ڈائناسورس کا ذخیرہ ہے۔ وہ ذرا سی عمر میں سب کچھ جان گیا ہے۔ لگاتار پڑھتا رہتا ہے، ٹیبلیٹ میں تلاش کر کے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا، وہ پوچھتا ہے۔ کئی بار ڈائناسور میوزیم میں جا کر صحیح جواب دے کر انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔

جب پلاسٹک کے ڈائناسور ٹوٹ جاتے ہیں تو اپنے گھر کے لان میں ایک گڑھا کھود کر اس میں گاڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اسے لگتا ہے ان سے پیٹرول بنے گا جو گاڑیوں کے کام آئے گا۔ ایک بار اس کی ٹیچر نے پیٹرول کی کہانی بتائی تھی تو اس نے اسے اپنی کار سے جوڑ دیا ہے۔

جانے سے پہلے کئی رشتہ دار ملنے آتے ہیں، اس سے پوچھتے ہیں۔ 'تمہارا گھر کہاں ہے؟'

وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتاتا ہے۔ 'میرے چار گھر ہیں۔ ان چاروں میں ایک میں ممی پاپا، ایک دادا دادی، ایک نانا نانی کا اور ایک اس کے ماما کا ہے پھر کچھ سوچ کر کہتا ہے۔ 'بٹ یونو، آئی لو مائی دادی' پھر شرما کر ہنستا ہوا بھاگ جاتا ہے۔

اس کی ساری باتیں جیسے گھر کی چہار دیواری میں قید ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ ابھی آ کر کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا۔ 'آؤ دادی کمپیوٹر گیم کھیلتے ہیں' اور دیر تک جیتنے کی خوشیاں منائے گا۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر پل صرف اور صرف جیتنے کی ریل پیل ہے۔ ایک معمولی سی شکست بھی ساری فتوحات پر کتنی حاوی ہے۔

❑❑❑

ساقی فاروقی

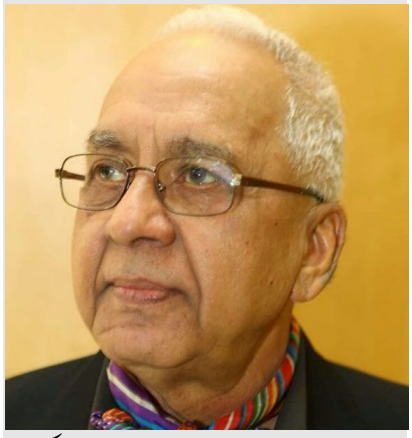

'پاپ بیتی' ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ ساقی فاروقی کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقع پر دسمبر ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' ساقی فاروقی پر مبنی ہوگا جس میں **بیدار بخت، اسد محمد خان، مشرف عالم ذوقی، زمرد مغل** وغیرہ کے مضامین شامل ہوں گے۔

پرل ایس بک
۱۸۸۲ ۱۹۷۲

دوسری زندگی

پیر کی صبح ڈریک فاریسٹر معمول سے بھی زیادہ بے دلی کے ساتھ سو کر اٹھا۔ سنیچر اور اتوار کے روز اس کے ایجنٹ کا دفتر بند رہتا تھا، اس لیے دو دنوں تک وہ نہ تو کوئی سوال کر سکا اور نہ ہی جواب سن سکا۔ سوال ہمیشہ وہی رہتا اور جواب بھی۔ ''کچھ پتہ چلا نِک؟''

''نہیں ڈریک، سوری، اب تک تو نہیں۔ میں نے چارہ تو کئی جگہ رکھا ہے، تمہیں بتایا ہی تھا، مگر کوئی مچھلی نہیں پھنسی۔''

''نہیں پھنسی؟'' اگلے دو جملے بھی ہمیشہ وہی رہے۔

''شکریہ نِک۔ اگر تھوڑی سی بھی امید۔۔۔!''

''مجھے پتہ ہے اولڈ مین۔ میں پانچ منٹ میں تمہارے دروازے پر رہوں گا۔'' اگلے الفاظ جھجکتے ہوئے بولے بھی جا سکتے تھے، نہیں بھی۔ ''کیا میں تمہیں بتا دوں میں کہاں رہوں گا؟''

''نہیں، نہیں، ابھی ایسا موقع نہیں ملا ہے اولڈ مین۔'' وہ ایک تیسرے درجے کی عمارت میں اپنے ایک کمرے کے فلیٹ سے کہیں باہر نہیں جاتا تھا۔ بس کبھی گھومنے یا کسی سستے سے ریستوراں میں کھانا کھانے باہر جاتا تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا، بالکل ختم، شروعات کی امید بجھ چکی تھی۔ وہ سارے کردار جو اس نے نبھائے تھے، آخری ڈرامے میں قریب قریب ہیرو تک، اسے کہیں نہیں پہنچا سکے۔ وہ ابھی عمر دراز نہیں تھا۔ مشکل سے پینتالیس کا، لیکن کامیابی کا سنہرا موقع کبھی نہیں آیا۔ اسے جو مواقع ملے تھے اس نے اس سے فائدہ تو اٹھایا، مگر وہ بطورِ ہیرو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ ڈرامہ نگار اس کی عمر کے کرداروں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ وہ جوان، مضبوط، طاقتور کرداروں کو لے کر ڈرامے قلمبند کر رہے تھے۔

> امریکہ کی پہلی مصنفہ جنہیں 'دَ گُڈ ارتھ' کے لئے ۱۹۳۸ء میں نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔ چونکہ ان کے والد کی زندگی کا زیادہ حصہ چین میں گزرا تھا لہٰذا ان کی کہانیوں میں چینی کسانوں کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی مشہور تصانیف میں سنس، دَ بنگ ریوولیوشنسٹ، دَمدر، دِز پرائڈ ہرٹ، دَ پیئر یاٹ، اَدر گاڈز وغیرہ شامل ہیں۔
>
> پیش ہے پرل ایس بک کی کہانی 'دوسری زندگی' جس کا اردو ترجمہ **'قاسم ندیم'** نے کیا ہے۔
>
> بشکریہ اردو چینل

وہ ایسا نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے وقت کے باہر پیدا ہوا تھا، اپنے وقت سے بہت پہلے یا بہت بعد میں۔ پرانی دنیا کی تہذیب ختم ہو چکی تھی اور نئی امریکی تہذیب کی ابتداء نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہی سب کچھ سوچ کر خود کو بری کرتا تھا۔ اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

خوش قسمتی سے اس نے شادی نہیں کی تھی، وہ اور سارہ انتظار کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ پھر سارہ نے کسی اور سے شادی کر لی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے کوئی الزام نہیں دیتا۔ پانچ سال بے حد طویل وقت ہوتا ہے اور اس کے بعد بھی سارہ کو کیا ملتا؟ برسوں پہلے تھا یہ سب، بارہ برس، تین مہینے، دو دن پہلے۔ اس نے سارہ کی تصویر بھی اخبارات میں نہیں دیکھی تھی، اس کے شوہر کے انتقال کے بعد، دو سال، چار مہینے، چھ دن۔ اس نے اسے کوئی چٹھی بھی نہیں لکھی۔

وہ بے دلی سے اٹھا اور اخبار لینے کے لیے دروازے تک آیا۔ فی الوقت یہی لمحات اس کے لیے آرام کے ہوتے تھے جب وہ اخبار لے کر اپنے گرم بستر میں گھس جاتا تھا۔ آج اس کا بستر خاص آرام دہ تھا۔ ٹھنڈی بسنتی ہوا آ رہی تھی۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے اس نے دیکھا بارش ہو رہی تھی۔ کم از کم اس کے پاس کمرے اور بستر کا تو سہارا تھا اور وہ اتنا ہوشیار تو تھا کہ بھوکوں مرنے کی نوبت نہ آئے۔ ایک وقت کھانا اور کرایہ طے تھا۔ اس طرح احتیاط میں کوئی خوشی تو نہیں تھی مگر خراب موسم میں باہر نکلنے کی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی۔ اس نے بتی کی طرف والی دیوار کے پاس اخبار پھیلایا اور تھیٹر والا صفحہ پلٹ کر اسے غور سے پڑھا۔ کوئی خبر نہیں تھی۔ اس موسم کے سبھی ناٹک جم چکے تھے اور اب گرمی کے تھیٹر میں ہی کچھ توقعات تھی۔ اسے اس بارے میں نِک پر زور دے کر بات کرنا ہوگی۔ نِک لاپرواہ ہوتا جا رہا تھا، دوستی اور پرانی

کامیابی کے روابط ڈھیلے پڑتے جارہے تھے۔ پھر بھی وہ کسی اور ایجنٹ کے پاس جانے کی ہمت نہیں جُٹا سکتا تھا، اگر کوئی اور اسے لے لیگا تب بھی۔ نِک کم از کم اسے جانتا تو تھا۔ اسے یہ نہیں بتانا پڑتا کہ وہ کیا کام کرسکتا ہے۔

اسی پل پلستر کی ہوئی دیوار پر پہلے سے بے ترتیب بتی گر پڑی۔ اس نے غصے میں اخبار پھینک دیا اور پھر سمیٹنے اٹھا ہی تھا کہ پھیلے ہوئے صفحات سے اسے اپنا نام جھانکتا نظر آیا۔

''ڈریک فاریسٹر اپنے گھر میں مردہ پائے گئے۔''

یہ آخری صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی۔ وہ اسے کھڑکی کے پاس لے گیا اور اپنی ہی موت کی خبر پڑھنے لگا۔ ''ڈریک فاریسٹر، اداکار اپنے بستر پر مردہ پائے گئے۔ انہیں لفٹ مین نے دیکھا جو اخبار پہنچانے آیا تھا۔ مسٹر فاریسٹر نے ابتدا میں مشہور براڈوے ڈراموں میں کام کیا تھا۔ انہیں ہالی ووڈ سے بھی کئی بار بلاوا آیا، مگر انہوں نے اسٹیج کو ہی فوقیت دی اور ہالی ووڈ کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ حالیہ برسوں میں۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔'' اخبار اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ وہ نِک کو فون کرنے دوڑا۔ اس خبر کی تردید کرنا ضرور تھا۔ نِک کو پریس میں خبر کرنی ہوگی، وہ اخبار والے کو نوٹس بھیجے گا۔ ادھر سے ہلکی سی آواز آئی، ''نکولس جین سین ایجنسی۔''

''اوہ، ہاں!'' اس نے ہمیشہ کی طرح پریشانی میں ہکلاتے ہوئے کہا، ''کیا مسٹر جین سن ہیں؟''

''مسٹر جین سن آج نہیں آئیں گے۔''

''اوہ، کیا آپ کو پتہ ہے کہ وہ کہاں ہوں گے؟''

''وہ یہاں نہیں ہیں۔ وہ ایک اہم کلائنٹ کے ساتھ ویک اینڈ منانے گئے ہیں۔''

''اوہ۔۔۔!'' وہ ہچکچایا۔ اس ٹھنڈی آواز کے آگے کیا کہا جائے، یہ نہ سمجھ پاتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔ ایک پل بعد وہ بستر میں تھا اور اس نے آنکھوں تک چادر اوڑھ لی تھی۔ اخبار زمین پر گر پڑا اور تنہائی میں ڈوب گیا۔ کسے فکر تھی کہ یہ خبر سچ ہے یا نہیں؟ طویل عرصے سے کسی نے اس کی کھوج خبر نہیں لی۔ اس کی بہن کی برسوں سے کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ شادی کے لیے ٹیکساس میں بس گئی تھی۔ اس کے والدین بیس سال قبل ہی چل بسے تھے۔ خدا کا شکر ہے تب یہ بھرم تھا کہ ان کا بیٹا بہت نامی گرامی انسان بننے والا ہے۔ تھیٹر سماجی زندگی تباہ کردیتا ہے۔ اس کے باہر آپ کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ اس لیے رشتہ دار، دوست احباب ایک ایک کرکے چھوٹ گئے۔ وہ مرہی تو گیا تھا۔

یہ مُردوں سی زندگی گزارنا بھی عجیب سا احساس پیدا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے کمرے میں زندہ تھا، سانس لے رہا تھا، مگر وہ مرچکا تھا۔ اس کا ڈرامائی دماغ کام کررہا تھا۔ اس نے کہانیاں پڑھی تھیں۔ اس موضوع پر ایک ڈرامہ بھی دیکھا تھا جب ایک شخص کے مرنے کا اعلان کردیا گیا مگر اس نے ایک نئی اور مکمل آزاد زندگی شروع کی تھی، سارے قرض معاف ہوگئے تھے۔ ساری ناکامیاں دور ہوگئی تھیں۔ وہ بھی چاہے تو اپنی آزادی کا خیر مقدم کرسکتا ہے، وہ بالکل نیا کچھ کرسکتا ہے۔ نیا نام رکھ کر سب جان پہچان والوں سے دور جاسکتا ہے۔ اس نے خود کو دنیا بھر میں گھومتے دیکھا، ہر شہر میں ایک الگ انسان کی طرح، لندن، پیرس، وینس یا شکاگو اور سان فرانسسکو۔ کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ وہ تھیٹر کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاہے وہ کچھ بھی کرے، خاتمہ یہی ہوگا، اکیلے کمرے میں، ایجنٹ کام کھوجنے کی کوشش میں لگا ہوا۔ اور کیا کوئی ایجنٹ بنا کسی پہچان والے آدمی کے لیے کام تلاش کرے گا؟ کم از کم ڈریک فاریسٹر کبھی کچھ تھا تو! ایک یاد تو تھی۔ طویل عرصے سے وہ رویا نہیں تھا مگر آج اسے رونا آگیا۔ چند آنسوؤں کے قطرے گرے وہ بھی خود کے لیے نہیں بلکہ اس جیسے ہر کسی شخص کے لیے۔ وہ اکیلا تو نہیں ایسی حالت میں۔ خود کو بھرم میں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے پاس تھوڑا سا ہنر

قصیدہ خالص عربی صنف ہونے کے باوجود فارسی ادب میں زبردست مقبول ہوئی۔ فارسی میں رودکی، منوچہری، ناصر خسرو، خاقانی، انوری، شیخ سعدی اور عرفی شیرازی جیسے شعراء نے قصیدے کی مقبولیت کو دوبالا کردیا۔ اردو ادب نے فارسی سے ہی قصیدہ کو مستعار لیا۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی نے اردو قصیدہ کی داغ بیل ڈالی۔ شمالی ہند میں سوداؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور اس کے بعد منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی جیسے شعراء نے قصیدہ گوئی میں اپنا نام پیدا کیا۔ دور حاضر میں گمان غالب ہے کہ یہ صنف بحرانی دور سے گزر رہی ہے حالانکہ کولکاتا، حیدرآباد، امروہہ، الہ آباد، فیض آباد، لکھنؤ اور بہار کے کچھ شہروں میں چند شعراء قصیدہ کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اردو علم و ادب کے حلقوں میں قصیدہ کے تئیں نئی نسل کا رجحان کمیاب ہے۔ ادارہ 'نیا دور' بہت جلد قصیدہ کے فن، روایت اور تاریخ پر ایک شمارہ شائع کرے گا۔ قلمی تعاون درکار ہے۔

(ایڈیٹر)

تھا،تھوڑی سی صلاحیت،اچھا بدن اور خوبصورتی۔ ہاں،وہ خوبصورت تھا،اب بھی ہے۔یہ سب چیزیں مل کر اسے اوسط سے کچھ اوپر لے آئے تھے۔مگر یہ کافی نہیں تھا اور اس سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے اتنا کافی نہیں ہوگا۔

بہتر ہے کہ مرہی جاؤں؟ یہ آسان ہوگا۔اس نے اس بارے میں سوچا تھا۔ایک اکیلے اور ناکام شخص کی طرح۔کبھی اس طرح کا قدم اٹھانے کے بارے میں طے نہیں کیا تھا۔مگر پھر بھی امکان تھا۔روزانہ رات کو نیند کی گولیاں نگلتے وقت وہ سوچتا کہ موت اس کی ہتھیلیوں پر ہے۔سفید سفید چھوٹی گولیاں دیکھتے ہوئے وہ اپنی معمولی صلاحیت کے ساتھ سوچتا۔اگر وہ چاہے تو ایسا کرسکتا ہے۔

اب کسی اور نے اس کے لیے یہ سب کر دیا تھا۔اس کے ہم نام شخص نے۔اس نے اخبار اٹھایا اور دوبارہ پڑھا۔اس کی موت کا کوئی سبب نہیں دیا گیا تھا۔بس خبر دی گئی تھی اس کی کچھ کامیابیوں اور آہستہ آہستہ اسٹیج سے دور ہونے کی وضاحت کی گئی تھی، یہ سب قابلِ افتخار لگ رہا تھا۔اگر ابھی وہ سچ مچ مرگیا تو اس کے اثرات ختم ہوجائیں گے۔یہ گندہ سا کمرہ، نِک کے پیچھے مسلسل لگے رہنا،پھٹی پرانی قمیض اور پاجامے، یہ سب چھوٹی چھوٹی اور بیکار باتیں جو وہ زندہ رہ کر تو چھپا سکتا تھا مگر موت کے بعد یہ سب کچھ ظاہر ہوجائے گا۔اسے تو شکر گزار ہونا چاہیے کہ کوئی اس کی جگہ اتنی اچھی طرح مرگیا ہے۔ انہوں نے پتہ صحیح دیا تھا،یہی عمارت، یہی سڑک۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔اور اچانک اسے بھوک کا احساس ہوا۔ وہ اٹھے گا، کافی اور ٹوسٹ بنائے گا اور نِک کو کبھی فون نہیں کرے گا۔وہ یہاں سے چلا جائے گا،کبھی مغربی سمت نکل جائے گا۔پھر یوں ہی ہالی ووڈ میں کوئی کام تلاش کرلے گا،سیٹ کے آس پاس۔دیکھ بھال کرنے والے کا کام بھی۔کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔کیوں کہ اس کا نام مرچکا تھا۔

بستر کے پاس کی میز پر وہ کافی پی رہا تھا کہ فون بج اٹھا۔وہ اٹھا اور کریڈل کان سے لگایا۔ ایک اجنبی آواز، کسی خاتون نے کہا،''کون بول رہا ہے، پلیز؟' اپنا نام اس کی زبان تک آیا،لیکن اس

نے قدرے توقف کے بعد کہا،''آپ کو کون چاہیے؟''

''میں نے ابھی ابھی اخبار میں دیکھا۔میں ڈریک فاریسٹر کو جانتی تھی، چند سال پہلے۔ہم نے ایک ڈرامے میں ایک ساتھ کام کیا تھا۔وہ بہترین اداکار تھا، میں اکثر سوچتی.....اور اب وہ نہیں رہا۔'' وہ ہچکچایا اور پھر اسی بھاری آواز میں بول اٹھا،''سوری میڈم،آپ کے پاس غلط نمبر ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا اور بستر پر بیٹھ گیا۔لیکن یہ حیرت انگیز تھا واقعی۔وہ خالی دیوار کو گھورتا آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا بیٹھا رہا۔لیکن آواز یاد نہیں کر پایا۔چلو کسی نے تو یاد رکھا۔اسے خوشی ہوئی اور اس نے بارش کا حال دیکھنے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھا۔موسم خوشگوار ہونے پر وہ گھومنے نکل جاتا۔مگر اب بھی بارش ہورہی تھی۔وہ واپس بستر میں داخل ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔وہ پھر اٹھا اور دروازہ کھولا۔عمارت کا پہریدار پھولوں کا چھوٹا سا باکس لیے کھڑا تھا۔

''اوہ،شکریہ۔''ڈریک نے کہا۔''ایک منٹ رکو۔''اس نے کرسی پر رکھی پینٹ کی جیب سے ایک چیز نکالی اور اسے دی۔''شکریہ۔'' پہریدار نے کہا۔

دروازہ بند کر کے اس نے باکس کھولا۔سفید گلاب اور اسنیپ ڈریگن تھے، ہرے فرن کے ساتھ۔کارڈ پر تحریر تھا،بہترین وفات کی یاد میں،اور نیچے سات نام درج تھے۔اسے وہ لوگ یاد تھے۔'ڈریڈ سرکل' ڈرامے میں ان لوگوں نے چھوٹے چھوٹے کردار ادا کیے تھے۔اس سال یہ ڈرامہ ہٹ ثابت ہوا تھا۔یہ تھریلر تھا اور وہ قتل کی گئی ہیروئن کا شوہر بنا تھا۔مگر اس ڈرامے کا ہیرو عاشق تھا،شوہر نہیں۔پھر بھی اچھا چلا تھا ڈرامہ اور اس نے وہ پیسے سارہ سے شادی کرنے کے لیے جمع کیے تھے۔لیکن اسی سال سارہ نے ہیریسن بیچ سے شادی کرلی تھی۔اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اگر وہ کامیاب ہوتا تو اس نے بھی کسی سے شادی کرلی ہوتی۔

اس نے پھولوں کو ٹن کی ٹوکری میں ڈالا اور پانی بھر کر کھڑکی میں رکھ دیا۔اس نے پھر سونے کی بجائے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔یہ اپریل تھا اور آسمان صاف ہورہا تھا۔اس نے شاور لیا اور سلیقے سے کپڑے زیب تن کیے۔جب تک سڑک پر آیا بادل چھٹ رہے تھے

اور نیلا آسمان بیچ بیچ سے جھانک رہا تھا۔وہ ہمیشہ کی طرح چھ بلاک گھوما اور چونکہ کوئی اسے نام سے نہیں جانتا تھا،اس لیے کوئی حیرت زدہ بھی نہیں ہوا۔اس نے ایک ڈرامے سے متعلق میگزین خریدا۔اور سوچا کہ پارک میں بیٹھنے کے لیے موسم ٹھنڈا ہے یا نہیں۔اس نے محسوس کیا کہ موسم زیادہ سرد ہے اس لیے وہ واپس کمرے میں چلا آیا۔ نِک کو فون نہیں کرنے سے اس کے پاس کام نہیں تھا مگر اس نے فون نہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔جب وقت آئے گا سوچا جائے گا کہ کہاں جانا ہے، یا پھر وہ کہیں نہیں جائے گا۔جب وہ کمرے میں آیا تو دروازے میں ایک لفافہ اٹکا ہوا تھا۔ یہ نِک کا تار تھا،''خدا کے لیے مجھے فون کرو۔گھنٹوں سے تمہیں فون کررہا ہوں۔شہر کے لیے پہلی ہی ٹرین سے لوٹ آیا ہوں۔''

وہ بیٹھ گیا۔ہیٹ اب بھی اس کے سر پر تھا۔اس کا کیا مطلب تھا، نِک کو اس کے مرنے کا یقین تھا یا نہیں؟ شاید اس نے خبر دیکھی ہو اور بھروسہ نہ کیا ہو۔یا پھر نِک کو لگا کہ اس کے ساتھ کوئی رہتا ہوگا۔اس نے نِک کو کبھی اپنے رہنے کے ڈھنگ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نِک کو لگتا تھا کہ اس کی کوئی محبوبہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔اسی نے تار بغل میں پھولوں کے گلدان کے پاس رکھ دیا اور باہر چلا گیا۔پارک کی بینچ پر اس نے پورا میگزین پڑھ ڈالا۔پھر وہ دوسرے لوگوں کو دیکھتا ،کچھ سوچتا بیٹھا رہا۔کچھ لوگوں کو اس نے پہچانا۔اسے لگا کہ وہ لوگ بھی اسے پہچان رہے ہوں گے۔لیکن ان کی کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔دوپہر کا وقت ہو رہا تھا اور اس نے کسی آٹومیٹ میں کھانا کھانے کا ارادہ کیا۔پھر واپس جا کر کمرے میں سونا۔وہ اپنے ہی احساسات کی بے ترتیبی سے تھک گیا تھا۔مرجانا بھی ایک قسم کا تجربہ ہے، وہ مسکرایا۔

پرانی عمارت میں داخل ہوتے وقت پہریدار باہر نکلا،''آپ کی سالگرہ وغیرہ ہے کیا؟'' اس نے کہا۔''آپ باہر تھے تو دو گلدستے اور تین تار آئے ہیں۔''

''آج میری برسی ہے۔''ڈریک نے کہا اور دوسرا ڈائم نکال کر پہریدار کو دیا۔گلدستے اٹھائے ہوئے اس نے تار جیب میں رکھے اور اوپر چڑھ گیا۔یہ سب عجیب سا ہوتا جا رہا تھا، اس کا کمرہ پھولوں سے بھر گیا اور اتنے تار۔یہ تو واپس تھیٹر کے ڈریسنگ روم میں ہونے جیسا تھا۔موت کی خبر پڑھ کر وہ خوش ہی ہوا تھا۔اس نے خود کو پوری طرح بھلا دیا گیا سمجھا تھا۔اسے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔اس نے پھولوں کو گلدان میں رکھ دیا۔ پیلے گلاب اور سفیدا سائریا۔اس کے پہلے ڈرامے کے ہدایت کار کی طرف سے۔تار اس کے دوسرے ڈراموں کے اداکاروں نے روانہ کیے تھے اور ایک تار نِک کے آفس میں کام کرنے والی لڑکی کا تھا۔

ڈریک کو معلوم تھا کہ وہ اس کے خواب دیکھتی ہے مگر اِن دنوں وہ سارہ کی بے وفائی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔کارڈ ہاتھ سے لکھا تھا ،'پیاری و خوشنما یادیں' لوئیس۔وہ اسے ہمیشہ مِس سلورسٹین پکارا کرتا تھا۔

کمرہ اچھا لگنے لگا تھا۔اس نے بستر نہیں بچھایا۔اکثر وہ اسے ایسے ہی چھوڑ دیتا تھا اور واپس لیٹ جاتا تھا۔مگر آج اس نے اچھی طرح بستر سمیٹا۔ایک پرانے رومال سے میز، الماری اور کھڑکی جھاڑی۔کچھ سوچنے کے بعد اس نے پیلے گلاب اور اسپائریا نکال کر ایک دودھ کی بوتل میں الماری پر رکھ دیئے۔

پھر فون بجنے لگا اور اتنا بجا کہ یا تو اسے باہر جانا پڑتا یا اٹھانا پڑتا۔اس نے اطمینان سے فون اٹھایا آواز بدل کر بولا،''ہیلو'' مگر یہ نِک نہیں تھا، یہ کسی خاتون کی آواز تھی جو بے حد نرم و سریلی تھی۔''ہیلو، کیا ڈریک فاریسٹر یہیں رہتے تھے؟''

''ہاں۔''اس نے جواب دیا۔پھر اس نے آواز پہچان لی۔اس کا دل بری طرح دھڑکا۔یہ سارہ تھی۔اس کی آواز آج تک سنی ان سنی آوازوں میں سب سے پیاری تھی۔

''میں نے ابھی ابھی یہ دکھ بھری خبر پڑھی۔'' سریلی آواز آئی۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں اس کی سروسیس کہاں ہوں گی؟ میں اسے برسوں پہلے جانتی تھی۔میں اسے

تحلیل ہوئے بن کے دھواں، شہر میں ایسے
ہم پھر نہ گئے گاؤں، کبھی گھر نہیں دیکھا

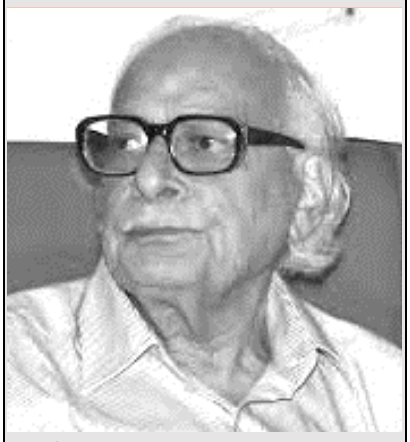

معروف ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی
فضیل جعفری بھی نہیں رہے۔
ان کا شمار اردو کے نمائندہ دانشوروں میں ہوتا تھا۔ان کی غیر ادبی تحریریں بھی ادبی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔
ادارہ 'نیا دور' جلد ہی فضیل جعفری کی **ادبی خدمات** پر ایک شمارہ معنون کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں **اسرار گاندھی، علی احمد فاطمی** وغیرہ کے مضامین شامل رہیں گے

بہت پیار کرتی تھی۔ اب بھی کرتی ہوں، مگر اب میں اسے کبھی نہیں بتا سکوں گی۔''

وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ کہتا بھی کیا؟ پھر بے وقوفوں کی طرح چند الفاظ اس کے منہ سے نکلے، ''آپ نے اسے بتایا کیوں نہیں؟''

ادھر سارہ حیرت زدہ تھی، ''کیا آپ اس کے دوست ہیں؟''

''ایک طرح سے دوست ہی ہوں۔ اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔''

''اوہ، سچ مچ! تو وہ مجھے بھولا نہیں تھا؟''

''کبھی نہیں۔''

وہ ان واقعات سے حیرت زدہ تھا۔ کیا یہ نیا جال تھا جس میں وہ خود ہی پھنستا جا رہا تھا۔

''اوہ، کیا آپ آ کر مجھے اس کے بارے میں بتائیں گے۔'' اس نے درخواست کی۔

''آپ کہاں ہیں؟''

سارہ نے کافی دور دراز سڑک کا نمبر بتایا۔ جہاں وہ تھا وہاں سے بڑی دوری پر۔ ''مجھے پتہ نہیں کب....'' اس نے شروع کیا۔

''نہیں، آپ ابھی آیئے۔'' سارہ نے پھر درخواست کی، ''مجھے اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا تجسس ہے۔ تب میں آپ کو بتا سکوں گی کہ کیوں.... دراصل میں نے اسے کھو دیا۔ جب میرے شوہر نہیں رہے تو مجھے پتہ نہیں چلا، میں اسے کہاں تلاش کروں؟ اخباروں میں بھی اس کا نام نہیں آتا تھا۔ آج میں نے خبر پڑھی تو مجھے لگا کہ میں ہمیشہ سے اسے تلاش کرنا چاہتی تھی۔ مجھے لگتا ہے میں بس سوچتی رہ گئی۔''

''میں آؤں گا۔'' اس نے وعدہ کیا۔ اس نے فون رکھ دیا۔ پتہ نہیں یہ وعدہ پورا کرے گا یا توڑ دے گا۔ مگر اسے اب سارہ کا ٹھکانہ مل گیا تھا تو آج نہیں تو کل، اسے معلوم تھا کہ وہ اس کی دہلیز پر کھڑا ہوگا۔ گھنٹی بجاتے ہوئے، اپنی شناخت کا انتظار کرتے ہوئے۔ وہ دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔

فون پھر بج اٹھا اور پھر سے سارہ کے ہونے کی امید میں اس نے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور پکڑا گیا، ''ہیلو...!'' اس نے بڑی بے تابی سے کہا۔

یہ نِک تھا، حیران پریشان۔ ''یہ کیا بے وقوفوں سی حرکت ہے۔ کہاں ہو تم صبح سے؟ مجھے معلوم ہے تم زندہ ہو؟''

''تمہیں کیسے معلوم تھا؟'' اس نے جاننا چاہا۔ اسے کچھ برا لگا۔ کیا نِک کو لگا کہ اس میں اتنی ہمت نہیں، ''تھوڑی دیر کے لیے مجھے لگا یہ سب سچ ہے، جھوٹے کہیں کے!'' نِک نے کہا، ''پھر میں نے خبر دوبارہ پڑھی اور دیکھا کہ وہ تم نہیں ہو۔ وہ تمہیں پینسٹھ سال کا بتا رہے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں؟''

''نہیں۔'' ڈریک نے کہا۔

''تمہیں کبھی تاریخیں یاد نہیں رہتیں۔'' نِک نے جلدی سے کہا، ''انہوں نے تمہاری تاریخ پیدائش ۱۸۸۷ء لکھی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سچ نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے اتنی تشہیر کا کام کیا ہے۔ اخبار اسے کل درست کر دے گا۔ میں صبح سے ہی بے حد مصروف رہا ہوں۔ لگتا ہے ورجینیا میں کوئی اور تمہارا ہم نام بھی تھا۔ اخبار والوں نے سب خلط ملط کر دیا ہے۔ اس سے سب گڑبڑ ہو گئی ہے۔ خیر اس سے تمہیں فائدہ ہی ہوا ہے۔ تمہیں ایک کردار مل گیا ہے۔''

''کردار؟''

''ہاں، اچھا خاصہ کردار۔ ویسے کوئی اسٹار والا رول تو نہیں ہے مگر ڈرامہ اچھا ہے۔ 'ساؤتھ سائڈ آف دمون' پہلے گرمیوں میں پھر براڈوے۔ پروڈیوسر نے کہا کہ وہ تمہیں جانتا تھا۔ اس نے مجھے فون کیا تھا اور کہا کہ اگر اسے اتا پتہ معلوم ہوتا تو وہ تمہیں ضرور کام دیتا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے کچھ وقت دو۔ تم سیدھے یہاں چلے آؤ، ڈریک! اور میں کنٹریکٹ تیار رکھوں گا۔ ہم سب کچھ درست کر لیں گے۔ اب میں پھر چیزوں پر دھول جمنے نہیں دوں گا۔''

ڈریک طے نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ ایک ساتھ دو جگہوں پر نہیں جا سکتا تھا۔ یا تو وہ پہلے سارہ کے پاس جاتا یا نِک کے پاس۔ اس کا ڈرامائی تخیل پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو سارہ کے ہال میں یا پھر

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

دیوان خانے میں انتظار کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر سیڑھیوں سے اترتی ہوئی سارہ، ہمیشہ سے ہی خوبصورت۔ وہ بالکل خاموش کھڑا رہے گا۔ انتظار کرتے ہوئے، پھر وہ چلائے گی، ''اوہ، ڈریک ڈارلنگ۔ لیکن یہ سب کیسے؟''

''کوئی اور مرا ہے سارہ، میں نہیں۔''

اس نے بوسہ لینے کے لیے آنکھیں موندیں اور نازک لب یاد کیے۔ سارہ بے حد نازک تھی۔ شہد بھرے لب تھے اس کے۔

''اے، تم سو گئے ہو کیا؟'' نِک اس کے کان میں چلایا۔

''میں ابھی نہیں آسکتا نِک۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔''

''کیا کام ہے؟'' نِک نے چیختے ہوئے کہا۔ ''کنٹریکٹ سے زیادہ کیا ضروری ہے؟''

''ہے کام، بے حد ضروری۔'' ڈریک نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا، ''لیکن کنٹریکٹ بنا کر رکھو نِک۔ میں وہاں آؤں گا کسی بھی وقت۔ آج، کل یا کسی اور دن۔'' اس نے فون رکھ دیا اور کھویا سا کھڑا رہا۔ وہ آج وہاں جائے گا۔ جب وہ اور سارہ صوفے پر بیٹھ جائیں گے اور ایک دوسرے کا بوسہ لیں گے۔ کھانا کھائیں گے اور ایک دوسرے کو جب ساری باتیں بتا دیں گے تب وہ گھڑی کی جانب دیکھے گا اور چلائے گا۔

''اوہ خدا، ڈارلنگ، مجھے آج کسی سے ملنا ہے۔ میں بھول ہی گیا تھا۔ تمہاری وجہ سے میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔''

''کوئی ڈرامہ ہے ڈریک؟''

''ہاں، ساؤتھ سائڈ آف دَمون۔ نیا ہے، اچھا لگتا ہے۔''

''جلدی آنا۔'' وہ یہی کہے گی۔ ''مجھے تم پر فخر ہے ڈریک۔'' یہی کہے گی وہ۔

''میں جلدی آجاؤں گا۔'' وہ وعدہ کرے گا۔ ''ہم ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔ اچھا؟ پھر ہم بیٹھ کر کچھ سوچیں گے۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' یہی کہے گی وہ، اپنی میٹھی آواز میں۔ یہ آواز پہلے سے بھی زیادہ شہد بھری تھی۔ وہ تیار ہونے کے لیے کمرے میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس کے پاس ایک نئی قمیض تھی۔ وہ ہمیشہ ایک نئی قمیض رکھتا تھا۔ کیا پتہ کسی ہدایت کار سے اسے ملاقات کرنی پڑے۔ پھر اس نے شاور لیا اور داڑھی بنائی۔ پھر نئی قمیض اور اچھا سا سوٹ۔ وہ ہمیشہ ایک اچھا سا سوٹ رکھتا تھا۔ پھر اس نے کچھ سوچا۔ اس کے لیے کچھ لے جانا چاہیے۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ شاید کوئی کام کی چیز، کتاب یا کچھ اور تلاش کرنے لگا تاکہ بطورِ نشانی دی جاسکے۔ پھر وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا، ''پھول اور کیا؟'' اس نے سارے پھول سمیٹے۔ ایک باکس نکالا۔ سارے پھول اس میں ڈالے اور بڑی احتیاط سے ڈوری باندھی۔ پھر اس نے الماری کھولی اور گھڑی نکالی پتلی بید کی چھڑی جس کے اوپر نقلی ہاتھی دانت کی نقاشی تھی۔ یہ چھڑی اس نے اس ڈرامے کے لیے خریدی تھی جس میں وہ شوہر بنا تھا۔

شیشے کے پاس رکتے ہوئے اس نے ایسے شخص کو دیکھا جسے اس نے ایک طویل عرصے سے نہیں دیکھا تھا، دراز قد، دبلا پتلا شخص۔ جس کا زرد چہرہ زندگی سے معمور تھا، چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جس کی گہری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ معصوم سا شخص۔ وہ اپنا عکس دیکھ کر مسکرایا۔ اس دوسرے جنم پر بے حد خوش۔ وہ جس قدر پہلے مر چکا تھا اس کے مقابلے یہ برا نہیں تھا۔ 'نیک خواہشات' اس نے خوشی و انبساط سے دمکتے چہرے سے کہا اور ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے اسے ذرا ترچھا کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

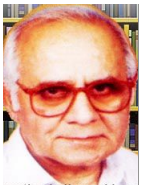

لاٹری

واسدیوموہی

کنوینرسندھی صلاحکار کمیٹی، احمد آباد

دن اچھا نکلا۔

کئی تاجروں سے وصولی ہوئی۔ کم سے کم دو لاکھ روپئے تو نقد ہوں گے۔ پچاس ہزار کے چیک ہیں، کیش ہوجائیں گے۔ انہیں بھی نقد ہی ماننا چاہئے۔ نوٹ اور چیک۔ احتیاط سے ایک بڑے لفافے میں رکھ کر پن لگادی۔ رقم اتنی بڑی مگر لفافہ کتنا چھوٹا بنا ہے! بڑے نوٹ چھاپ کر حکومت نے بہت اچھا کیا۔ کتنی سہولت ہوگئی ہے۔

سیمپل کے بڑے تھیلے (بیگ) میں نوٹوں والا لفافہ ڈالتا ہوں۔ اندر سے نیپکن نکال کر چہرے سے پسینہ خشک کرتا ہوں۔ بہت گرمی ہے۔ نیپکن واپس رکھ کر بیگ کی زپ لگا دیتا ہوں۔ اب پاپا کو یقین آئے گا کہ میں بھی کچھ کرسکتا ہوں۔ میں زیادہ تعلیم نہیں حاصل کرسکا۔ دل ہی نہیں لگتا تھا۔ دوسری طرف میری ضد تھی کہ میں بزنس کروں گا۔ نہیں کرنی ہے مجھے ملازمت، کسی کی غلامی۔

'بزنس کے لئے روپئے چاہئے۔ کہاں ہے ہمارے پاس؟'

'پاپا! آپ تو بس مجھے کہیں سے تین لاکھ کا انتظام کردیں۔ باقی میں خود کرلوں گا۔'

'پاپا نے تمام عمر کپڑے کی دکان پر نوکری کی تھی۔ بڑی مشکل سے گھر چلاتے تھے۔ تین لاکھ کہاں سے لاتے۔ میں بھی ضد پر اڑا رہا کہ کروں گا تو بزنس کروں گا، نہیں تو گھر بیٹھ کر روٹیاں کھاؤں گا۔ لاڈلا، اکلوتا بیٹا ہوں اس لئے ممی کچھ زیادہ ہی دھیان رکھتی ہیں۔ روٹی پر گھی زیادہ چپڑتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ ہیں۔'

آخر پاپا نے ہمت کی۔ ایک پرانے دوست سے بات کی۔ دوست نے کم سود پر دو لاکھ روپئے دے دئے۔ ممی نے اپنے زیورات نکالے۔

میں ابتدا میں تھوڑا سہم گیا۔ بزنس میں نقصان بھی تو ہوسکتا ہے۔ مگر پاپا نے حوصلہ دیا۔ 'اب جب سوچ لیا ہے تو آگے بڑھو۔ جھولے لال کی مہربانی سے سب اچھا ہوگا۔'

سندھی زبان کے مشہور ادیب **واسدیو سدھنانی 'موہی'** کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں تضاد، صبح کتھے آہے، برف جو ٹھیل خاصی شہرت کی حامل ہیں۔ ان کی مشہور کتاب 'برف جو ٹھیل' پر ۱۹۹۹ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی 'لاٹری' جس کا اردو ترجمہ **ڈاکٹر بانو سرتاج** نے کیا ہے۔

زیورات فروخت ہونے پر چھیاسٹھ ہزار روپئے ہاتھ آئے۔ کچھ نقد، کچھ ادھار پر مال اٹھالیا۔ ہوگئی دکان شروع، شرٹ کا بزنس بھی کافی دلچسپ بھی ہے اور کمائی والا بھی۔ ہاں ادھاری زیادہ دینی پڑتی ہے، کاریگروں سے ماتھا پچی بھی کرنی پڑتی ہے تو پیکنگ کرنے والوں کے نخرے بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

آج پہلی مرتبہ وصولی کے لئے نکلا تھا۔ اچھی وصولی ہوئی ہے۔ آرڈر بھی بہت ملے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس کا رخ کرتا ہوں۔ وڑودہ میں ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب میں فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کروں گا۔ وصولی کرنے کے لئے نہیں، وصولی تو میرے ملازم کریں گے۔ میں صرف گاہکوں سے ڈیل کرنے کے لئے آؤں گا۔ میرے برانڈ کی شرٹ کیسی لگتی ہیں؟ کپڑا کیسا لگتا ہے؟ میرے برانڈ کو گراہک کتنا پسند کرتے ہیں؟ دوسرے بزنس والوں کے مقابلہ میں میری شرٹس کی مانگ کتنی ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں، ہاں، 'مارکیٹ سروے' کرنے کے لئے آؤں گا۔ پھر تمام عمر ہی آلتو فالتو سستی شرٹس تھوڑے ہی بنواتا رہوں گا میں! بڑا مینوفیکچر کہتے ہیں نا، وہ بنوں گا۔ پاپا صحیح کہتے ہیں۔ نالج ضروری ہے، سب کچھ ملے گا۔ میں بڑی گارمنٹ فیکٹری لگاؤں گا۔ ممی بے حد خوش ہوں گی۔ ان کے لئے بیس بیس ہزار روپئے کی بنارسی ساڑیاں خریدوں گا۔

بھوک لگی ہے۔ گیسٹ ہاؤس سے کچھ پہلے رکشہ سے اتر جاتا ہوں۔ اندھیرا ہونے لگا ہے۔ سڑک کے کنارے ایک نوجوان لڑکی نے اسٹال لگا رکھا ہے۔ آملیٹ بنا کر گراہکوں کو دیتی نظر آرہی ہے۔ چائے بنا کر بھی پلا رہی ہے۔ کمال کی پھرتیلی ہے۔ تیکھے نین نقش، بڑی بڑی کالی آنکھیں، رنگ اجلا، سب کچھ اجلا اجلا لگ رہا ہے۔ سوچتا ہوں، یہیں کچھ کھالوں۔ گیسٹ ہاؤس والے تو لوٹتے ہیں۔ چائے کے ہی بیس روپئے لے لئے کل۔ لڑکی کے ریستوران میں لوگوں کی بھیڑ

ہے۔ایک چھوٹے چبوترے پر اسٹوو رکھا ہے۔اسٹوو پر توا ہے۔توے پر چمچہ سے تیل ڈال کر، انڈا پھوڑ۔ پھینٹ کر نمک مرچ ڈال کر وہ توے پر پھیلا دیتی ہے۔جلدی جلدی آملیٹ بنانے کے ساتھ توے کے ایک کونے میں سینکنے کے لئے بریڈ سلائس بھی رکھ دیتی ہے۔پھر وہیں کے وہیں آملیٹ سینڈوچ بناتے ہوئے بیچ بیچ میں چائے کی پتیلی اسٹوو پر رکھ دیتی ہے۔اس کی پھرتی چستی دیکھ کر میں حیرت زدہ ہوں۔ یہ سوچ کر کہ وہ پہلے آئے گراہکوں کو نپٹا دے تب میں آگے بڑھوں گا۔ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں۔لڑکی کی پشت کی طرف دیوار پر چھوٹے سے بورڈ پر اندھیرے کے باوجود ریٹ لسٹ صاف نظر آرہی ہے۔ایک انڈے کا آملیٹ اور دو سلائیس، دو انڈوں کا آملیٹ اور سلائس۔ ٹوسٹ تیل میں، ٹوسٹ مکھن میں، چائے، میں رک جاتا ہوں۔ پوری فہرست نہیں پڑھتا۔ بے وقوف ہوں، میں نے چائے گیسٹ ہاؤس میں کیوں پی؟

کرم جلی، او کرم جلی! اچانک اسٹال کے پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی۔

'ابھی آئی' لڑکی نے اونچی آواز میں جواب دیا۔اس کا رسپانس اتنا فطری تھا جیسے کرم جلی ہی اس کا نام ہو اور وہ اس سے مانوس ہو۔اس نے اسٹوو کی لو دھیمی کی، آنکھوں ہی آنکھوں میں گراہکوں سے اجازت طلب کی اور چبوترے سے سٹی پتلی گلی میں چلی گئی۔جلدی ہی وہ لوٹ آئی۔شاید بیمار امی کی کوئی فوری ضرورت رفع کروانے گئی تھی۔لوٹ کر اس نے پہلے مٹی کے تیل کا چراغ جلایا۔اندھیرے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

گراہک اب کم ہو گئے ہیں۔میں بیٹھنے کی جگہ کی تلاش میں نظریں گھماتا ہوں۔ ایک جگہ دو پتلی پٹیاں ڈال کر بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوئی نظر آئی۔ایک گراہک وہاں پہلے ہی سے بیٹھا ہے۔ چبوترے کے پاس بنی اس جگہ پر میں بھی بیٹھ جاتا ہوں۔مگر پٹیوں کی چوڑائی کم ہونے سے گرتے گرتے بچ جاتا ہوں۔ دیوار کا سہارا نہ ہوتا تو گر ہی جاتا۔سنبھل کر بیٹھتا ہوں اور بیگ احتیاط سے گود میں رکھ لیتا ہوں۔لڑکی میری طرف دیکھتی ہے۔

ایک انڈے کا آملیٹ، دو سلائیس اور چائے۔

چار گراہک جو ایک ساتھ تھے پیسے دے کر جاتے ہیں۔ پتلی پٹی پر بیٹھا گراہک بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں بیگ پٹی پر رکھ کر زِپ کھولتا ہوں اور نیپکن نکالتا ہوں۔بیگ گر جاتا ہے۔میں اسے اٹھا کر پھر پٹی پر رکھتا ہوں۔نیپکن سے پسینہ پونچھ کر اندر رکھتا ہوں اور زپ بند کر دیتا ہوں۔

لڑکی توے پر انڈے پھیلا رہی ہے۔ پھر وہ چبوترے پر رکھی ہوئی جھوٹ پلیٹیں اٹھا کر پانی سے بھرے ٹب میں ڈالتی ہے۔میرے ساتھ بیٹھا گراہک پیسے دے کر جاتا ہے۔

'مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔' گلی سے کسی مرد کی آواز آتی ہے۔

'ایک وقت کی نماز نہ پڑھنے سے تمہاری جنت خطرے میں نہیں پڑ جائے گی۔اس سے بہتر یہ ہے کہ جا کر میری دوا خرید لاؤ۔میں مر رہی ہوں۔'

یہ آواز پہلی آواز سے زیادہ اونچی تھی۔آواز اسی عورت کی ہے جس نے لڑکی کو کرم جلی کہہ کر پکارا تھا۔ ایک بوڑھا شخص لڑکی کے پاس آتا ہے۔اس کی سفید داڑھی ٹھڈی اور اس کے آس پاس اگی ہوئی ہے۔اس کی پیشانی پر سجدوں کا گہرا نشان ہے۔نماز کا چٹّا۔

جمیلہ! سو روپئے دے دے بیٹی! نماز کے بعد لوٹتے ہوئے تیری امی کی دوا لیتا آؤں گا۔اسٹوو کی لَو کم کر کے لڑکی گول ڈبے میں سے چھوٹے بڑے نوٹ نکالتی اور گنتی ہے پھر اس بوڑھے کی طرف بڑھا دیتی ہے۔

'لیجئے ابو!'

جلدی سے توے سے آملیٹ اتارتی ہے۔ سلائیس رکھنا بھول گئی تھی، رکھتی ہے، سینکتی ہے۔آملیٹ کے ساتھ پلیٹ میں رکھ کر مجھے دیتی ہے۔میں نزدیک رکھے اپنے بیگ کو دیکھتا ہوں، زِپ بند ہے۔

'آپا! سو روپئے دے دو، سنیما جانا ہے۔آئس کریم بھی کھانی ہے۔' ایک لڑکا آ کر لڑکی کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔

'سنیما جانا ہے تو ایسے بول رہا ہے جیسے بڑی نوکری پر جانا ہو۔کمانا دھمانا نہیں ہے مگر آنکھوں کی عیاشی کے ساتھ زبان کا چٹخارہ بھی برقرار رکھنا ہے۔' لڑکی نے تیزی سے کہا۔

'کرم جلی! کیوں گندے پیسوں کے لئے سونے جیسے بھائی کو آنکھ دکھا رہی ہے۔اس بڈھے کو تو فوراً پیسے نکال کر دے دیتی ہے۔وہ کون سا کماتا ہے؟ تمام دن سفید داڑھی میں دھول ڈالتا رہتا ہے۔فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی پانچ نمازوں کے علاوہ اسے کچھ اور سوجھتا ہے اسے؟ یہاں بھلے ہی دوزخ میں زندگی گزار رہا ہے، وہاں اسے جنت چاہئے۔' کرخت آواز والی عورت چلا چلا کر بول رہی تھی۔

لڑکی مجھے چائے دیتی ہے۔

'آپا دیکھنا، ایک دن یہ ٹھیکرے ٹھا کرے چھوڑ کر تم میرے سیون اسٹار ہوٹل کی چکن بریانی کھاؤ گی۔'

'ہوا میں تیر بھانجا بند کر۔ بہت باتیں بناتا ہے۔سارا دن جی توڑ محنت کرتی ہوں۔ لاٹری نہیں لگتی ہر روز۔'

گلی میں سے زور زور سے کوسنے کاٹنے کی آواز آتی ہے، 'ہائے اللہ! یہ کیسی زندگی ہے! اس کرم جلی کو بھائی پھوٹی آنکھ نہیں سہاتا ہے۔یہ سب دیکھنے سے اچھا ہے کہ تو مجھے اپنے پاس بلا لے۔کم سے کم اس دوزخ سے تو چھٹکارا ملے گا۔'

'جلدی دو آپا، دیر ہو رہی ہے۔' لڑکا گول ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔لڑکی درمیان ہی میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔لڑکا زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر

ڈبے سے نوٹ نکالتا ہے اور بغیر گنے جیب کے حوالے کر دیتا ہے۔

'برا ہوگا، دیکھنا خواجہ، بہت برا ہوگا تیرا۔' دکھ کی ماری وہ رلائی روک نہیں پائی۔ مٹی کے تیل کا چراغ بھک بھک کر کے بجھ جاتا ہے۔ میں اسے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ پیسے دے کر بیگ لے کر گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا ہوں۔ بیگ رکھ کر کمرے میں اندر سے آٹو میٹک تالا لگا کر خود کو پلنگ پر پھینک دیتا ہوں۔ فوراً ہی آنکھ لگ جاتی ہے۔

آنکھ کھلتی ہے۔ رات کے نو بجے ہیں۔ آرام کافی ہوا۔ رقم کا حساب کروں۔ ہاتھ منھ دھوتا ہوں۔ تازہ دم ہوکر بیگ کھولتا ہوں۔ بل بک، رسید بک، سیمپل نکالتا ہوں۔ ایک ایک کر کے سب چیزیں نکال لیتا ہوں۔ اچانک چونک جاتا ہوں۔ لفافہ ندارد ہے۔ تمام چیزوں کا دوبارہ جائزہ لیتا ہوں۔ لفافہ نہیں ہے۔ میرے کان سرخ ہو گئے ہیں۔ رگوں میں خون اچھلنے لگتا ہے۔ بیگ میں ہاتھ ڈال کر میں نے کونا کونا کھنگال ڈالا، ٹٹول کر دیکھا کہ استر تو پھٹا ہوا نہیں ہے، نہیں، لفافہ نہیں تھا۔ میرے سامنے امی کی لال، آنسوؤں سے بھری، رو رو کر سوجی ہوئی آنکھیں گھوم گئیں، پاپا کا زرد چہرہ مجھے ڈرانے لگا۔ شاید میرا خود کا چہرہ بھی ویسا ہی ہو گیا تھا۔ فیوز بلب جیسا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سیمپل جھٹک جھٹک کر دیکھے۔ بل بک، رسید بک بار بار جھٹکیں۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی لفافہ نہیں ہے تو نہیں ہے۔ میں رونے پر آجاتا ہوں۔ سامنے آئینے میں میرا عکس نظر آرہا ہے۔ مجھ سے بالکل مختلف۔ میں اپنے آپ کو نہیں پہچان پا رہا ہوں۔ آنکھیں، بال، ناک، میرا مکمل وجود مجھے اجنبی لگ رہا ہے۔ بدحواس حالت میں باہر نکلتا ہوں۔ یقیناً ہی ناشتہ کرتے ہوئے میرے ساتھ پٹی پر بیٹھے ہوئے شخص نے یہ کارنامہ انجام دیا ہوگا۔ اسی لئے وہ فوراً چلا گیا وہاں سے۔ کیا کروں؟ پولیس تھانے جاؤں؟ کیا ملے گا وہاں جا کر؟ یاد کرتا ہوں، آخری مرتبہ میں نے لفاف کو کب دیکھا تھا؟ سب یاد ہے۔ نوٹ ڈال کر، لفافہ سنبھال کر بیگ میں رکھا تھا۔ زِپ بند تھی اور بیگ پورے وقت میرے ساتھ تھا۔ کہیں لاوارث نہیں چھوڑا تھا بیگ میں نے۔ وہ آدمی یقیناً جیب کترا، لچّا، لفنگا رہا ہوگا۔ پیسے لے گیا۔ مجھے جیتے جی مار گیا۔ مجھ بے وقوف کو پتہ ہی نہیں چلا۔ سڑک پر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں، بے وقوفوں کا شہنشاہ ہوں، جیسے لاکھوں روپے چرانے کے بعد وہ وہیں اس علاقہ میں ٹہل رہا ہوگا۔ پھر بھی میں اس جگہ گیا

جہاں میں نے چائے پی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید وہ لڑکی اس آدمی کو پہچانتی ہو۔ ہوسکتا ہے وہ اس کا روزانہ کا گراہک ہو۔ ہر روز چائے پینے آتا ہو۔ وہاں پہنچا، وہ جگہ سنسان تھی جیسے خواب خرگوش میں ہو۔ اندھیرا تھا، چبوترا خالی تھا، میں پتلی گلی میں گھستا ہوں۔ لڑکی کے ابو کے ہنسنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ لڑکی نظر نہیں آرہی ہے۔ انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا، پوچھا، 'کیا چاہئے؟'

'جی معاف کریں۔ آپ کی وہ لڑکی کہاں ہے؟'

'کیا کام ہے؟' انہوں نے خوفناک لہجے میں پوچھا۔

'مجھے اس سے ایک گراہک کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔'

'خاموش رہ بدمعاش! کون سا گراہک؟ کس کا گراہک؟ بھاگ جا یہاں سے۔' ان کے الفاظ میں دھمکی تھی۔ مجھے احساس ہوا، اگر ایک اور منٹ میں یہاں کھڑا رہا تو وہ مجھے جہنم رسید کر دیں گے۔ میں گلی سے باہر نکل آیا۔

ختم! سب کچھ ختم ہو گیا۔ قرض، قرض اور صرف قرض رہ گیا جسے ادا کرتے کرتے عمر نکل جائے گی۔ پاپا کی طرح مجھے بھی کپڑے کی دکان میں نوکری کرنے پڑے گی۔ قدرت کا قانون توڑنے چلا تھا۔ بھول گیا تھا اولاد کو باپ کی وراثت سنبھالنی پڑتی ہے۔

'بابو جی!' وہ چائے والی لڑکی تھی۔ 'مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔' اس نے لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے محسوس ہوا میں ہوا میں پہنچ گیا ہوں۔ نہیں، میرے پاؤں تو زمین پر ہی ہیں۔ شاید میرے دل نے اونچی چھلانگ لگائی ہے۔ لفافہ ہاتھ میں لے کر میں نے اسے تولا۔ پیسے دے کر آپ جیسے ہی روانہ ہوئے، پٹی کے نیچے مجھے یہ لفافہ نظر آیا۔ طے تھا کہ آپ کا ہی ہوگا۔ آپ کے بعد وہاں کوئی اور نہیں بیٹھا تھا۔ میں لفافہ لے کر آپ کے پیچھے آئی تھی مگر آپ نظر نہیں آئے۔ لوٹ کر میں نے چبوترا بڑھایا اور امی کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ سوچ کر آپ لفافہ ڈھونڈتے ہوئے ضرور آئیں گے۔ آخر چھوٹی رقم تو ہے نہیں۔ بس تھوڑی دیر کے لئے چھپر کے نیچے گئی تھی کہ آپ آگئے۔ میں اسے دیکھتا رہا، صرف دیکھتا رہا۔ کچھ کہہ نہیں سکا۔ گویا پیدائشی گونگا تھا۔ اس کی کالی آنکھوں کی چمک اندھیرے میں بھی صاف نظر آرہی تھی۔

❑❑❑

ہاسٹل کا باتھ روم

مصطفیٰ علی
ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
موبائل: 8896869738

ایک دن مولانا نے فضائلِ جنت پر لب کشائی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''پیشاب پاخانہ وغیرہ دنیا کی مادی غذا کا غیر مفید جزو ہے۔ جنت کی غذاؤں میں کوئی ایسا جزو شامل نہیں ہوگا اس لیے وہ مکمل ہضم ہوکر جزوِ بدن بن جائے گی اور قضائے حاجت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

جنتیوں کی ڈکار مشک کی خوشبو کی طرح ہوگی یہ قضائے حاجت کے قائم مقام ہوگی اور ان کا پسینہ مشک کی خوشبو کی طرح ہوگا اور یہ پیشاب کے قائم مقام ہوگا۔''

اس بیان کو سن کر ہم نے دل ہی دل میں غالبؔ کا یہ شعر گنگنایا تھا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

کیونکہ ہمیں اس وقت جنت کی یہ فضیلت بالکل دو کوڑی کی معلوم ہوئی تھی مگر ایک دن ہم پر ایسا آن پڑا کہ ہمیں مرحوم چچا غالبؔ اور ان کے اس شعر دونوں پر ہی لاحول پڑھنا پڑا اور جنت کی اس بظاہر ادنی فضیلت کو اعلی ترین فضیلت تسلیم کرنا پڑا۔

ذکرِ واقعہ سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ اس کم ترِ شوریدہ موج کا حلقۂ یاراں بہت وسیع ہے، اس لیے اکثر و بیشتر خانۂ خاکسار پر خوش گپیوں اور ادبی وغیرادبی نشستوں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔ اس دن بھی ایسی ہی ایک نشست منعقد تھی۔ دورانِ جلسہ ہی مجھے شدتِ بول نے دبوچا تو میں نے سوچا کہ آدابِ محفل کا لحاظ رکھا جائے اور نشست برخاست ہونے سے پہلے باتھ روم نہ جایا جائے، لہذا میں نے اسے دبائے رکھا پھر جیسے ہی احباب رخصت ہوئے میں فی الفور کمرے سے نکلا اور دروازہ تیزی سے بھیڑتے ہوئے بیت الخلاء کی جانب بھاگا۔ حیف! جس کا ڈر تھا وہی ہوا، اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک لمحہ گنوائے بغیر میں نے دوسرے باتھ روم کا رخ کیا وہ بھی دور سے بند نظر آیا پھر بھی تسلیِ دل کی خاطر میں نے قریب جا کر اسے جھٹکا دے کر دیکھا، میرا شک صحیح نکلا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ دارالاقامہ کے تیسرے منزلے پر جس طرف میری رہائش تھی اس طرف بس یہی دو عدد کھڈیاں تھیں۔

میں مضطرب کھڑا کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں، تبھی دفعتاً مجھے کچھ یاد آیا اور میرا چہرہ کھل اٹھا۔ میں فوراً نیچے کی طرف بھاگا۔ وہاں سات باتھ روم بالترتیب ہیں۔ میں نے پہلے باتھ روم کے دروازے پر زوردار لات ماری اور اس کے ساتھ ہی اندر گھس گیا۔

''او...وو...وق...آک...تھو'' اندر کا منظر دیکھ کر طبیعت متلانے لگی۔ مگ پاخانے کی پیالی میں اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور غایط کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس غایط کے ڈھیر پر لاتعداد مختلف النوع مسلح کیڑے اس طرح چکر لگا رہے تھے جیسے کسی قلعے کی نگرانی کر رہے ہوں۔ اس سے کچھ فاصلے پر کاکروچوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار پوری کھڈی میں ہاہاکار مچائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ طہارت خانہ نہیں بلکہ ان کا میدان کارزار ہو۔ یہ مشاہدہ میری طبیعت پر نہایت گراں گزرا۔ میں جتنی تیزی سے اندر گیا تھا اتنی ہی تیزی سے باہر نکل آیا۔ پھر دوسرے باتھ روم کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کا دروازہ پھوپھر دیکھ کر دل کو راحت ملی۔ میں نے بلا تاخیر اس کو زور کا جھٹکا دیا۔

''ارے تری ....سالے.... اندھے.... رک بتاوَتھی۔'' ٹوائلٹ میں کوئی موجود تھا جس کی گالی سن کر میں ہڑبڑا گیا۔ اپنے کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا: ''اندر سے بند نہیں کر سکتے تھے؟'' ''کئیسے بند کرِت بے، کنڈی تہرے باپ کہن سے لیائیت۔'' اس نے بہت غصے میں جواب دیا۔

شدتِ بول سے میرا دم نکلا جا رہا تھا اس لیے میں نے اس سے الجھنا بےکار سمجھا، لہذا اسے بڑبڑاتا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ چیک کیا تو تیسرے، چوتھے، پانچوے اور چھٹے باتھ روم کا دروازہ بند ملا البتہ ساتویں کا کھلا ہوا محسوس ہوا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اس مرتبہ بڑے احتیاط سے آہستہ آہستہ دروازے کا پٹ سرکایا۔ آہا! یہ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا کہ اس کے اندر نہ کوئی شخص موجود تھا اور نہ ہی کموڈ گندہ تھا۔ مانو میرے دل کی مراد پوری ہوگئی۔ ویسے جب سے میں نے برطانوی اخبار ''ڈیلی میل'' میں آسٹریلیا کی سڈنی یونیورسٹی کے ماہر ''ونسینٹ ہو'' کی نئی تحقیق کی رپورٹ پڑھی ہے تب سے مغربی طرز کے ٹوائلٹ میں رفع حاجت کرنا تقریباً ترک کر دیا ہے مگر مجبوری کا نام مہاتما گاندھی۔ میں نے جھٹ سے اندر داخل ہوکر سٹکنی لگائی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میری نظر ٹوٹی پر پڑی تو میں

غصے سے بھوت ہوگیا۔ وہاں صرف ایک نٹ کسا ہوا تھااور ٹوٹی ندارد تھی، میں نے پائپ کو دبا کر چیک کیا وہ بھی ناکارآمد تھا۔ میں غم زدہ حالت میں وہاں سے نکل آیا۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے ناپاک ہونے سے بال بال بچالیا۔ اب انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ اور کھڈیاں دور تھیں وہاں جانے کا مطلب تھا ''نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم'' کا مصداق بننااور کیا پتہ ادھر بھی یہی منظر ہو اس لیے ایک طرف کھڑے ہوکر میں ان کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

نہ پوچھو اس وقت میرے اوپر کیا گذر رہی تھی۔ انتظار کی ایک ایک گھڑی برسہا برس کے مترادف تھی۔ ان لمحوں کو جھیلنے میں مجھے جو تکلیف محسوس ہو رہی تھی اس کی شدت مجنوں کو لیلیٰ کے، فرہاد کو شیریں کے اور مغیث کو بریرہ کے انتظار میں محسوس ہونے والی تکلیف کی شدت سے کسی طرح بھی کم نہیں رہی ہوگی۔ بادشاہ ہارون رشید نے رفعِ حاجت کی قیمت کیوں اپنی آدھی سلطنت بتلائی تھی اور ہندوستان کی موجودہ حکومت 'شوچالیہ ابھیان' کے تحت جگہ جگہ ٹوائلٹ بنوانے پر اتنا زور کیوں دے رہی ہے یہ مجھے اس وقت اچھے سے سمجھ میں آرہا تھا۔ آپ یقین جانیے صاحب! یہ اتنا نازک لمحہ ہوتا ہے کہ اس گھڑی منتظر شخص حضرتِ کھڈی نشین کو اول جلول، الم غلم کچھ بھی بک سکتا ہے۔ یہ تو خاکسار تھا کہ چونکہ بزرگوں میں بیٹھا بہت ہے اس لیے اب تک سراپا آداب بنا ہوا تھا ورنہ انشاؔ اور منتظرؔ جیسا کوئی شوخ ہوتا تو جھلا کر کہہ دیا ہوتا ''اندر دہنت شاشۂ عالم۔''

پیشاب کی تیزی کے سبب اب میرا پیٹ بھی بڑبڑانے لگا تھا۔ حالات پر قابو پانے کے لیے میں نے دانتوں کو دانتوں پر جما کر بھینچنا شروع کیا، جس کی وجہ سے رخسار پھولتے پچکتے اور منہ کی ساخت عجب طرح کی بن جاتی۔ جب یہ نسخہ کارگر نہ ہوا تو میں آگے پیچھے کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک جگہ کھڑے ہوکر میں نے پیروں کی اٹھا پٹک شروع کر دی پھر ایک ہاتھ کی انگلی دوسرے سے بجانے لگا۔ ایک مرتبہ بجاتے ہوئے بے خیالی میں میری انگلی اتنی پرزور طریقے سے دب گئی کہ اس کی تکلیف سے میں بلبلا اٹھا۔ کچھ دیر میں ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا رہا پھر بھی بات نہ بنی تو بالآخر میں نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔

''نہ جانے اندر کیا کرنے لگتے ہیں کم بخت۔ باتھ روم میں داخلہ کیا مل گیا مانوں سکندر کی سلطنت مل گئی۔ سیٹ پر ایسے جم کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے شاہجہاں کے تختِ طاؤس پر براجمان ہو گئے ہوں۔ دنیا وما فیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں خار پشت۔ ناہنجاروں کو اس کی بو میں مشک کی خوشبو کا مزہ ملتا ہے تبھی تو اس میں پہنچتے ہی خوابوں کی وادیوں میں سیر کرنے لگتے ہیں۔ معشوق کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ کچھ نالائق تو اسی میں اپنا سبق یاد کرنے لگتے ہیں اور شاعر مزاج حضرات کا تو پوچھئے مت، اس میں بیٹھتے ہی ان پر اشعار کا الہام ہونے لگتا ہے۔ وکلا صاحبان کو تو اس میں تشریف لاتے ہی اپنے پیچیدہ مقدمات کی تدبیر سوجھنے لگتی ہے۔ سائنس دانوں پر اس میں آتے ہی غور وفکر کے یلغار ہونے لگتی ہے لہٰذا جب تک وہ اپنے اگلے منصوبے ترتیب نہ دے لیں بھلا کیسے نکل سکتے ہیں۔ موسیقار ٹٹی کی دھن میں کھو کر اپنی نئی دھن تلاشنے لگتا ہے اور گلوکار صوتِ گوز کے مدوجزر میں محو ہوکر نیا سرنئی لے بنانے لگتا ہے۔ مصور بول و براز کے رنگ وروپ میں ڈوب کر کوئی انوکھا پیکر ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ چور کو بیت الخلاء کی خلوت اتنی راس آتی ہے کہ وہ چوری کے نئے نئے ہتھکنڈے اپنے ذہن میں ایجاد کرنے لگتا ہے اور کچھ لوگوں کا کیا کہنا! کھڈی کی ہاٹ سیٹ پر تشریف رکھتے ہی سیاسی داؤ پیچ کا ایسا سیلاب ان کے دماغوں میں امڈتا ہے کہ وہ وہی بیٹھے بیٹھے ملک کی قسمت کا فیصلہ تک کر ڈالتے ہیں۔ اب بھلا انھیں کون سمجھائے، سبھی تو اپنے مغلق مسائل لے کر اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور باہر نمبر پر کھڑے شخص کا کسی کو ذرا سا بھی خیال نہیں رہتا۔''

جب انتظار حد سے تجاوز کر گیا تو صبر نے میرا ساتھ چھوڑ دیا لہٰذا میں نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اب مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں دروازہ اندر سے بند نہ ہو کیونکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ شرارتی بچے اندر سے باتھ روم کی کنڈی لگاتے ہیں پھر اس کے دیوار اور چھت کے درمیان پڑی کھالی جگہ سے کود کر بھاگ جاتے ہیں۔ ادھر لوگ قطار پر قطار لگائے کھڑے رہتے ہیں۔ گھنٹوں بعد انکشاف ہوتا ہے کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں نے دروازہ بھڑبھڑانے کے ساتھ اب آواز لگانا بھی شروع کر دی ''ارے کون ہو بھائی، جلدی باہر نکلو، کتنی دیر لگاؤ گے، اوروں کو بھی موقع دو'' اندر سے کوئی آواز نہیں آئی اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ اب تو میرا شبہ یقین میں بدلنے لگا۔ دلاسۂ دل کی خاطر میں نے سوچا کیوں نہ اندر جھانک کر دیکھ لوں۔ میں نے باتھ روم کی دیوار کے سہارے اوپر چڑھنا شروع کیا لیکن تبھی کسی کے پیروں کی چاپ سنائی دی، کوئی باتھ روم کی طرف آرہا تھا۔ مجھے اپنا عمل شرافت کے خلاف لگا اس لیے جہاں تک پہنچا تھا وہیں سے چھلانگ لگا کر نیچے آگیا اور من ہی من سوچنے لگا کہ

''شہر سے اچھا تو گاؤں، دیہات ہے کہ تیل یا موبل کے کسی خالی ڈبے میں پانی بھر لو اور کسی کھیت یا میدان میں جھاڑا پھرنے چلے جاؤ۔ اگر کسی وجہ سے پانی ساتھ لے کر نہیں جا سکے یا گھاس پھونس کی حرکت سے وہ خدانخواستہ گر جائے پھر بھی کوئی دقت نہیں، نہر، ٹیوب ویل، پمپ سیٹ، پوکھرا یا تال تلیا کچھ نہ کچھ تو کھیت کے قریب مل ہی جاتا ہے۔ نپٹنے کے بعد آدھا پینٹ اٹھا کر وہاں پہنچ جاؤ اور پانی چھولو۔''

ہائے رے قسمت! ابھی تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ میں نے مزید انتظار کرنا کارِفضول سمجھا۔ میں پھر بدحواس سا اوپر کی طرف بھاگا۔ وہاں پہنچ کر ذرا

ٹھہرا پھر اپنے پھولے ہوئے سانس کو قابو میں کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے دونوں باتھ روموں پر نگاہ ڈالی، دونوں کے دروازے اب بھی بند تھے۔ اب میرا پارا گرم ہو گیا تھا۔ میں کبھی سر کھجاتا، کبھی انگلیاں پھوڑتا، کبھی پیروں کی اٹھا پٹک کرتا، کبھی دانتوں کو پیستا اور کبھی بے اختیار آگے پیچھے کرنے لگتا۔ اس حالت میں کبھی منہ بدبداتا تو کبھی پیٹ گڑگڑاتا اور کبھی دونوں ہم نوا ہو جاتے۔

''کیا کر رہے ہو بھائی، بہت ٹینسن میں لگ رہے ہو'' اچانک ادھر سلیم بھائی آ دھمکے تھے اور انھوں نے مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر پوچھا تھا۔

''کیا بتاؤں استاد، دنیا میں ہر روز کوئی نہ کوئی مر رہا ہے ٹینسن تو رہے گا ہی۔''

''ارے واہ! یہ تو وہی بات ہو گئی کہ 'سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔''

''ہاہاہا۔۔۔'' دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

''بھڑ بھڑ۔۔۔ پڑ پڑ پڑ۔۔۔ بھڑاک۔''

''ہاہاہاہاہا۔۔۔'' باتھ روم سے اچانک آئی اس غیبی آواز نے ہم دونوں کی تیز ہنسی کو چند لمحے کا وقفہ دے کر تیز تر کر دیا۔ سلیم بھائی بھی بہت مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ وہ جاتے جاتے موقعے کی مناسبت سے یہ شعر سناتے گئے۔ ملاحظہ فرمائیں:

بیت الخلاء سے آئی آوازِ با ترنم
شاید کوئی حسینہ پیچش میں مبتلا ہے

میری آنکھوں کے سامنے اب تارے ٹمٹمانے لگے تھے اور تاریکی سی چھانے لگی تھی۔ میرے دماغ کا وَولٹج بھی بہت ہائی ہو گیا تھا۔ اب تو مجھے جا ضرور خطا ہونے کا ڈر بھی ستانے لگا تھا۔ میں تیز قدموں سے چل کر داہنی طرف والے باتھ روم کے پاس پہنچا اور اس کا دروازہ اتنی زور سے کھٹکھٹایا جیسے وہ باتھ روم کا دروازہ نہیں بلکہ مندر کا گھنٹہ ہو۔ دفعتاً دروازہ کھل گیا۔ میری روح کو تسکین ملی۔ میں نے سوچا نکلنے والا مجھ پر غصہ ہوگا لیکن اس نے میری طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر تبسم کیا اور چل دیا۔ میں نے چین کا سانس لیا اور اندر گھس گیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں میرے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پیخانے کا ظرف آب وغلاظت کے گھول سے پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ وہاں ایک سیکنڈ بھی رکنا میرے لیے دشوار تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بائیں باتھ روم کی جانب روانہ ہوا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس کے دروازے کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔

''آآآآ۔۔۔''

اندر کوئی موجود تھا جو کنڈی کھول کر شاید نکلنے ہی والا تھا کہ میرے ناگہانی دھکے سے زمین پر دھراشائی ہو گیا۔ میں بھی چونکہ حالات سے بے خبر تھا اس لیے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک طرف لڑھک گیا۔ میں نے فوراً اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑے اور چوٹ بھلا کر پہلے کھڈی کی طرف دیکھا۔ اس پر گاڑھے کالے، پیلے داغ کائی کی طرح جمے ہوئے تھے۔ میں نے اس وقت اسی کو غنیمت جانا۔ اندر گرا ہوا شخص اب اٹھ چکا تھا۔ وہ مجھ پر بہت خفا تھا۔ میں نے کسی طرح منت سماجت کر کے اسے باہر نکالا اور سٹکنی لگا کر قدمچہ پر بیٹھ گیا۔ موسم تو پہلے سے ہی بنا ہوا تھا اس لیے کو نھتنا نہیں پڑا۔ پہلے ادرار ہوا پھر فوراً' پیٹ میں اینٹھن ہوئی اور دھڑ سے پیخانہ ہوا۔ اسی بیچ میری نگاہ سامنے کی دیوار پر پڑی جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا ''دائیں دیکھو'' میں نے دائیں دیکھا تو مرقوم تھا ''بائیں دیکھو'' بائیں جانب نگاہ ڈالی تو تحریر تھی ''پیچھے دیکھو'' اور جب پیچھے دیکھا تو وہاں شاہکار اعضاء کی ایسی تصویری نمائش موجود تھی اور ایسے ایسے اقوال وعلوم منقش تھے کہ اللہ کی پناہ۔ میں تو اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس دیوار پر کسی مجنوں نے اپنے دل کے پھپھولے بھی پھوڑے ہوئے تھے اور کسی دل جلے کے دلی ارماں بھی اس پر خوبصورتی سے بہہ گئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی چیزیں اس دیوار پر مزین تھیں جن کا بیان خلافِ آداب سمجھا جائیگا۔ بس اتنا جان لیجیے کہ اگر بچے اس کا مشاہدہ کر لیں تو وقت سے پہلے جوان ہو جائیں۔ ان تحاریر وتصاویر کا مشاہدہ کرنے کے بعد میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر یہ قوم اپنی تخلیقی مہارت تہذیبی سانچے میں ڈھال کر دیواروں سے باہر لاتی تو کتنی ترقی کر جاتی لیکن افسوس کہ یہ قوم ابھی تک دیواروں کی تہذیب بھی نہیں سیکھ پائی۔

باتھ روم کی دیوار سے یاد آیا کہ ہندوستان کے ایک مشہور شاعر تھے ''شہریار''۔ جن دنوں فلم ''امراؤ جان'' کے لیے لکھے گیے ان کے نغمے زبانزدِ خاص وعام تھے۔ انھیں دنوں انھیں ضعفِ مثانہ کی بیماری لاحق ہو گئی تھی جس کی وجہ سے انھیں بار بار باتھ روم جانا پڑتا تھا۔ انھیں نغموں سے درج ذیل شعر کسی شرارتی بچے نے منتخب کر کے ان کے باتھ روم کی دیوار پر لکھ دیا تھا۔

اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار
دیوار و در کو غور سے پہچان لیجیے

ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے شعر کا ایسا برمحل استعمال خود ان کا مذاق بنانے کے لیے کبھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے بہت کوشش کی پر اس طالبِ علم کو نہیں جان پائے۔ اس شرارت پر یک گونہ سا قلق انھیں مرتے دم تک رہا۔ حاجت رفع کرنے کے بعد میں نے ٹوٹی گھمائی۔ وہ نہیں گھمی۔ میں نے پھر ذرا سختی سے گھمائی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تیسری مرتبہ میں نے پورے دم خم کے ساتھ کوشش کی تو ٹوٹی نکل کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کے نکلنے کے ساتھ ہی وہاں سے پانی کی ایسی تیز وتند دھارا رواں ہوئی کہ میں اپنے آپ کو بچا نہ سکا اور پوری طرح گیلا ہو گیا۔ میں بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا، سٹکنی سرکائی اور سرلٹکائے دل میں یہ ارمان سجائے اپنے کمرے کی طرف چل دیا کہ ''کاش! میں چارلس ڈکنس کی ہیروئین ہوتا تو یہ دن نہ دیکھتا۔''

❑❑❑

فکشن کی کتابیں محض ساڑھے دس فیصدی...!!

ادارۂ نیادور کو گزشتہ تقریباً ایک سال سے زیادہ کے عرصہ میں ۱۶۱/کتابیں تبصرے کے لئے موصول ہوئیں۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے قطعی حیرت نہیں ہے کہ ان میں سے زیادہ تر کتابیں تنقیدی نوعیت کی اور شعراء کے مجموعے ہیں۔ محض ۱۵-۱۶ کتابیں ہیں جو فکشن سے تعلق رکھتی ہیں۔

یہ اعداد و شمار اردو ادب کے اس چلن اور ٹرینڈ کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اردو میں آج بھی شاعری کو جو اعلیٰ درجہ عطا کر دیا گیا ہے، فکشن اس سے ابھی بہت دور ہے۔ نغمگی تو غزل کی بنیادی خوبی مانی ہی جاتی ہے لیکن جب سے گائیکی نے غزل کو گلے لگا لیا تب سے ایسے شعراء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے جن کی نگاہ پردۂ سیمیں پر زیادہ اور ادب پر کم ہے۔ دعویٰ تو یہ بھی ہے کہ شاعر ہی Celebrity کا درجہ حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ خام خیالی صرف اردو تک محدود ہے۔ ہندوستان ہی میں اروندھتی رائے، وکرم سیٹھ اور جھمپا لاہری جیسے Celebrity شاعر نہیں ہیں اور عالمی سطح پر جتنے بھی تخلیق کاروں نے Celebreties کا درجہ حاصل کر لیا ان میں تقریباً تمام شاعر نہیں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہم اردو والوں میں ابھی تک شاعری کے تئیں ہماری عقیدت باقی ہے لیکن فکشن کو اس قدر نظر انداز کرنا کسی بھی حد تک ادب کے لئے سودمند نہیں کہا جا سکتا۔

اردو فکشن کے زندہ و جاوید کردار امراؤ جان ادا کی Re Discovery 'خواب سراب' نامی ناول کے صفحات کی خصوصیت ہے اور ناول نگار ہیں انیس اشفاق۔ یہ ان کا دوسرا ناول ہے۔ اردو میں Fact-Fiction کو بھی ابھی تک قبولیت کی سند حاصل نہیں ہو پائی ہے تو کسی کردار کی Re Discovery کے بارے میں تصور کرنا ذرا مشکل ہے لیکن انیس اشفاق نے یہ جوکھم مول لیا اور انگریزی ادب کی طرز پر جہاں ایک ایک کردار پر کئی کئی قلم کار اپنی تخلیقات رقم کرتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر انہوں نے ان گلیوں اور حویلیوں کی خاک چھانی جہاں امراؤ جان ادا سے متعلق واقعتاً تھیں، لکھنؤ کے چوک میں رہتی تھیں، رسوا نے ایک کردار گڑھا، انیس اشفاق نے ہے۔ 'بزازے سے چوک کی طرف آنے حسین کا پھاٹک تھا، یہیں تھا ان کا پردو ناول لکھے اور پہلے میں سب کچھ صحیح لکھا جان کی کوئی اولاد تھی۔ یہ بات بھی ان کے چھوٹے تھے تو جس خوبصورت بزرگ جان تھیں۔ یہ پورا ناول چوک، گول

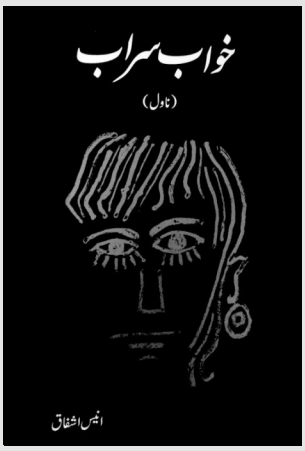

باقیات حاصل ہو سکتے تھے۔ امراؤ جان رقص و موسیقی کی ملکہ تھیں یا مرزا محمد ہادی اس کی تہہ تک جانے کی کامیاب کوشش کی والی گلی کے ختم پر یہ جو چھتہ ہے یہ کبھی حیدر مکان۔' مرزا محمد ہادی رسوا نے امراؤ جان اور دوسرے میں کچھ اور، یہ بھی کہ امراؤ ناول میں ابھر کر سامنے آ گئی ہے کہ جب وہ عورت سے وہ ملے تھے، غالباً وہی امراؤ دروازہ، پھول والی گلی، مسجد تحسین علی خاں، کوچۂ میر انیس، چاول والی گلی سے لے کر اکبری گیٹ تک کے اردگرد پھیلا ہے۔ قدیم لکھنؤ کے ان علاقوں اور کرداروں کے مکالمے، جزئیات نگاری اور کرداروں میں وہ فضا، وہ خوشبو اور وہ تاثر جو قدیم لکھنؤ کا خاصہ ہوا کرتا تھا، سب کچھ موجود ہے اور وہ بوباس بھی جو گزشتہ لکھنؤ کی فخریہ شناخت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ 'خواب سراب' کئی معنی میں اردو فکشن میں زبردست اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی مخصوص زبان اور لکھنوی محاوروں کے لئے ہی اس ناول کو پڑھا جانا اپنے آپ میں ایک contributory تجربہ اور معلوماتی اضافہ ہے۔ امراؤ جان ادا جیسے لافانی کردار پر انیس اشفاق کا یہ ناول نئی نسل کے اردو اسکالرس کے لئے مشعل راہ بھی بنے گا۔

اردو میں تنقید بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر کسی بھی ریسرچ اسکالر سے لے کر کوئی بھی معتبر ادیب و شاعر قلم اٹھا لیتا ہے۔ دوسری زبانوں میں یہ وبا اتنی عام نہیں ہے۔

جون ۲۰۱۸ء کے شمارے میں ہم نے منتخب چار شعری مجموعوں کا مختصر تعارف اور تبصرہ شائع کیا تھا اور تقریباً ۱۶-۱۷ شعری مجموعوں کا مختصر تعارف شائع کیا تھا کیونکہ اتنی بڑی تعداد میں موصول ہونے والی تمام کتابوں پر تبصرہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس شمارے میں ہم نے فکشن سے تعلق رکھنے والی ۱۷/کتابوں کا مختصر تعارف اور چار نمائندہ افسانوی مجموعے/ناول پر تبصرے شائع کر رہے ہیں۔

'بیچ ندی کا مچھیرا'

صادقہ نواب کا سحر کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اسی سال شائع ہونے والے اس مجموعہ میں ۱۳/افسانے شامل ہیں۔ صادقہ نواب سحر کا اسلوب داستان گوئی سے کافی حد تک متاثر نظر آتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں قدرت کے حسین مناظر سے لے کر کرداروں کی معنویت کے ساتھ ساتھ کہانی کے پس منظر کی سوندھی خوشبو بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس مجموعہ میں ان کی ایک کہانی کا عنوان 'الو کا پٹھا' بھی ہے جس میں آج کل کے تعلیمی اداروں میں نظام تعلیم اور تہذیبی بحران کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا گیا ہے۔

جدید دور کی نئی اور نت نئی تہذیب سے روبرو

ہونے والے وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں یہ سب کچھ راس نہیں آتا خاص طور سے وہاں جہاں تہذیب وتعلیم کی تربیت کی جاتی ہے۔ صادقہ نواب سحر نے اپنے افسانوں میں کچھ ایسے نسوانی کرداروں کو بھی بڑے سلیقہ سے گڑھا ہے۔ یہ کردار آج کے دور کی وہ شوخ لڑکیاں ہیں جنہیں اپنی دیرینہ روایات سے بہت زیادہ انسیت نہیں ہے لیکن جنہیں دور حاضر کے دنیاوی معاملات پر بڑی زبردست مہارت حاصل ہے، اور شاید یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔ اپنے تمام افسانوں میں صادقہ نواب سحر قاری کو کہانی آخر تک پڑھنے کے لئے باندھے رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

'علاقائی زبانوں کی کہانیاں' ڈاکٹر بانو سرتاج کی یہ ایک بیحد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستان کے آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل زبانوں کی کہانیوں کا اردو ترجمہ شامل ہے۔ انتساب شری پت رائے جی (فرزند منشی پریم چند) کے نام ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج فی الوقت ان چند لکھنے والوں میں سے ہیں جو بیک وقت اردو، ہندی اور مراٹھی زبانوں میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔ مشمولہ زبانوں کی کہانیوں کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ ہر کہانی متاثر کرتی ہے۔ ہر کہانی اپنے اپنے علاقائی رنگ اور روپ سے بھرپور ہے۔ ان کی کہانیوں میں روزمرہ کی زندگی کے کھٹے میٹھے، تیکھے، کڑوے اور کسیلے تجربات علاقائی عصبیت کے ساتھ شامل نظر آتے ہیں۔ مقدمہ میں ڈاکٹر بانو سرتاج نے حقیقت بیانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ کتاب میں درج کہانیوں میں سے ہندی اور مراٹھی کہانیوں کے ترجمے براہ راست انہیں زبانوں سے کئے گئے ہیں جب کہ بقیہ تمام کہانیاں ہندی سے ترجمہ شدہ ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

راجیو پرکاش ساحر کا افسانوی مجموعہ **'پیاسی سیلیں'** اسی سال شائع ہوا ہے جس میں ان کے گیارہ افسانے شامل ہیں۔ کتاب دیدہ زیب ہے، اس کے علاوہ ان کے افسانوں پر چار تاثراتی مضامین بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ راجیو پرکاش ساحر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سائنسی معاملات کو بھی اپنے افسانوی فن میں ڈھالنے کے ماہر ہیں۔

ان کے افسانے اس معاملے میں سب سے منفرد ہیں کہ ان کے یہاں سائنسی تجربات، ایجادات اور اس سے ہونے والے خاطرخواہ فائدے اور نقصانات پر ان کے کردار بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'خلائی موسیقی' ان کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں سات آسمانوں اور خلاء کی پراسراریت کا بیان ماں بیٹی کے درمیان خلائی پرواز کو لے کر جو بحث ومباحثہ ہو رہا ہے اور آفتاب کے جاہ و جلال اور ماہتاب کی شبینہ چاندنی سے لے کر مریخ، زہرہ، عطارد، مشتری وغیرہ کی خلاؤں میں چالبازیوں کے انوکھے طلسم پر افسانوی پیراہن میں بڑی خوبی سے گفتگو کی گئی ہے۔

ان کے دوسرے افسانوں میں بھی اسی قسم کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ زبان ہندی زدہ ضرور ہے لیکن گراں ذرا کم ہی گزرتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر سفینہ بیگم کا ناول 'خلش' گزشتہ سال کی اشاعت ہے جس پر کئی تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ سفینہ کی تحریر پختہ اور

افسانوں میں عورت کی جنسی نفسیات کو مرکزی علامت بنا کر بیحد کامیاب افسانے اور ناول لکھ کر مشہور ہوئے شموئل احمد کا ناول **'گرداب'** گزشتہ سال شائع ہوا۔ ناول کے پہلے صفحے پر ہی ستاروں کو ڈھونڈنے کی سعی اور نسوانی حسن کے خدوخال کے پراسرار بیان سے ان کے اس ناول کی کامیابی بھی نظر آجاتی ہے۔ عورت کے جسم کے حصوں کے زمزمے اور ہمہمہ کی تاویل کو ہندو دیومالا، زائچہ شناسی اور ٹیروکارڈ کی پیشگوئی سے منسلک کرنے کا فن اردو ادب میں غالباً اگر کسی کے پاس ہے تو وہ شموئل احمد ہی ہیں۔ 'سنگاردان' جیسی شہرۂ آفاق کہانی کے خالق شموئیل احمد کے ریاکاریوں پر مرد کی اجارہ داری کا کرداروں کے نام زائچے کے خانوں کے کرداروں میں پائل کی چھم چھم، گیسوؤں عورت کی چھاتیوں کے کساؤ اور اس کے کہیں مرد نظر آتا ہے، یا تو وہ احمق، ڈھک یا ہے، اور عاشق تمام تر درجات سے بالا کی عورت پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے اور مستفیض ہوسکتا ہے، شموئیل احمد نے بخوبی خلوص سے بڑھ کر کوئی خلوص نہیں' اور 'کیا شموئیل احمد اس طرح کے ڈھیروں معمے زائچہ شناسی کے توسط سے بتاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول میں انہوں نے کچھ ہندو دیوتاؤں کے بارے میں جو اطلاعات افسانوی انداز میں بیان کر دی ہیں، وہ اردو ادب میں ایک بڑا اضافہ کبھی نہ کبھی ضرور تسلیم کیا جائے گا۔ شموئیل کی گفتار کا اثر بھی ناول کے تقریباً ہر صفحات پر صاف محسوس ہوتا ہے۔ ان کے تمام افسانوں اور ناولوں میں بہار کی شہری زندگی سے لے کر مضافات کی مخصوص مٹی کا سوندھا پن بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی بہترین کہانی 'سنگاردان' کئی ملکی وغیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

اس ناول میں بھی جنسی تلذذ اور جنسی خوبصورت بیان ملتا ہے۔ ناول کے تمام اثر سے نکلتی ہوئی آوازوں پر مبنی ہیں۔ ان سے نکل کر آنے والی ہواؤں کی مہک، جسم سے اٹھتی ہوئی حرارت کے علاوہ جہاں گاؤدی اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ عاشق تر ہے۔ کس نچھتر میں کون سا سیارہ کس راشی اس سے کون، کب، کن حالات میں بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق 'جسم کے محبت اپنے پہلو میں شیطان بھی رکھتی ہے؟'

رواں ہے۔ 'خلش' میں وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں اس کی ترسیل میں کوئی خارجی علت حائل نہیں ہوتی اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ پلاٹ، کردار اور مکالموں سے لے کر بیانئے تک کئی مرتبہ ایسے مناظر آئے ہیں جن کی دلچسپ روداد اور کردار نگاری قاری کو متاثر کرتی ہے۔

'خلش' چار لڑکیاں جو مختلف لیکن روایتی ماحول میں پرورش پاتی ہیں، ان کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کے تانے بانے سے بنا گیا وہ معاشراتی ناول ہے جس میں واقعات کی ترتیب اور کرداروں کی پیشکش ایک دم فطری محسوس ہوتی ہے۔ طوبیٰ اپنی تمام فکری پیچیدگیوں کو اس طرح بیان کرتی نظر آتی ہے گویا کہ وہ ہم سب کی زندگی کی پیچیدگیاں ہیں۔ سفینہ کے اس ناول میں بار بار محسوس کرایا گیا ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی اس مرد اساس معاشرے میں عورت کو اپنی خواہشات کا خون کرنا پڑ رہا ہے۔

رینو بہل اردو افسانے کا معتبر نام ہے۔ ان کا ناول **'میرے ہونے میں کیا برائی ہے'** گزشتہ سال شائع ہوا جس نے حلقۂ ارباب وسخن کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس سے قبل ان کے دس افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انہوں نے ہندی اور پنجابی زبانوں کی کئی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو زبان میں کیا ہے۔

'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' زبان کے اعتبار سے بھی متاثر کرتا ہے اور کردار اور مکالمے بھی بہتر ہیں۔ خطۂ پنجاب کے پس منظر کی اس کہانی میں کافی کچھ ایسا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ منظر کشی کے اعتبار سے بھی اس ناول کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کائنات، جنس اور مرد و عورت کی جسمانی تبدیلیوں پر رینو بہل نے جس عالمانہ ڈھنگ سے اپنی بات کرداروں کے ذریعہ رکھی ہے، اس کی تعریف نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

ناول کی کہانی ایک متوسط گھرانے کے گرد گھومتی ہے جہاں ایک لڑکا سات آٹھ برس کی عمر میں جب اپنے جنس کے برعکس گفتگو اور حرکات وسکنات شروع کرتا ہے تو اسے کن مشکلات اور تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ شکھا بن جاتا ہے۔ LGBT کو جب ترقی یافتہ ممالک کی طرز پر ہندوستان میں بھی قانونی حیثیت حاصل ہوئی تب رینو بہل کے اس ناول کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ انہوں نے اس بات کو بڑے عمدہ ڈھنگ سے پیش کی ہے کہ اپنی فطری جنس کے برخلاف رویہ سماج میں ابھی بھی کس قدر ناقابل قبول ہے اور نہ صرف ناقابل قبول ہے بلکہ تضحیک کا سبب بھی ہے۔ ہمارے یہاں ایسے افراد جو پورے طور سے نہ مرد ہیں اور نہ عورت، ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا ہے جب کہ درحقیقت اس میں ان کی کوئی خطا نہیں ہوتی۔ جو بھی ہوتا ہے سب کچھ فطری ہی تو ہوتا ہے۔ رینو بہل اس ناول کے عنوان 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' سے ہی ان افراد کے درد کو بیان کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔

'ببول' تنویر اختر رومانی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مجموعہ میں ۲۰/افسانے شامل ہیں۔ یوں تو انہیں زندگی کی سچائیوں کو افسانہ بنانے والا فنکار کہا گیا ہے لیکن دراصل وہ اپنی کہانیوں میں ان کرداروں کے توسط سے بہار اور جھارکھنڈ کے علاقوں کی خصوصیات اور وہاں کی رسم ورواج کا بدرجۂ اتم احاطہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اسرار گاندھی اردو افسانے کا معتبر نام ہے۔ **'ایک جھوٹی کہانی کا سچ'** ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ بنت، ہیئت، نفس مضمون، واقعے کی تحلیل نفسی، نفس الامر میں اس کا وجود، اسلوب بیاں، غیر معروف جزیات کا عرفی حیثیت سے بیان، مختصر لفظوں میں بڑی بات کہہ جانے کا فن اسرار گاندھی کو بخوبی آتا ہے۔ وہ جمادات کو بھی آمادۂ اظہار خیال کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں بولتی ہیں کہ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ زندگی ان کا ہاتھ تھام کر چل رہی ہے اور کہیں کہیں اس نے ان سے پوچھا بھی ہے۔ ''کہرے سے ڈھکی ایک رات'' زندگی کے ایک ایسے ہی رنگ کی کہانی ہے۔ شہروں کی آلودگی، اس کی فضا پر جمی کثافت کی تہیں اور اداس ہوائیں۔ اندھیرا ایسا کہ اپنا وجود ہی انسان کو اجنبی لگے اور وہ اپنے ہی ہیولے سے ڈر جائے۔ اسرار گاندھی کے افسانے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے اور بالعموم نظر انداز کر دئے جانے والے موضوعات کو بڑی خلاقی سے مباحثہ تک پہنچا دیا ہے۔ مجموعہ کی ایک اور خصوصیات ان کا تین سطری انتساب بھی ہے جس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کی کہانیاں قاری سے مکالمہ کریں گی اور کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد کریں گی۔

اسرار گاندھی وہ افسانہ نگار ہیں جو جدید دور کے تمام تقاضوں اور معاملات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور اپنے افسانوں میں ان کرداروں کے ذریعہ وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جسے کہنے کے لئے سیکڑوں صفحات درکار ہوتے ہیں۔ بظاہر ان کے افسانوں کی زبان سادہ ہے لیکن اسی میں زندگی کی پیچیدگیوں اور معموں کو آسانی سے حل کرتے ہوئے اس خوبصورتی سے گزر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اداسی کا عنصر بار بار کسی نہ کسی روپ میں ضرور نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے گو کہ یہ جدید دور کی زندگی کا لازمی جز بن کر ہم سب کے سامنے آچکا ہے۔ اسرار گاندھی نے اس بیماریٔ عام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کے سفر کو اپنے افسانوں میں بڑے عمدہ ڈھنگ سے مکالموں میں پرو دیا ہے۔

ان کے کئی کردار وہ سب بیان کرتے ہیں جن میں سماج کا درد و کرب تو شامل ہے ہی، فرسودہ روایات کے نتیجہ کے طور پر برداشت کیا جانے والا سچ بھی سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں وہ اردو ذرا کم نظر آتی ہے جس کے ہم سب عادی ہیں، ان کی زبان ہندی آمیز الفاظ سے مزین ہے۔ ان کا مجموعہ ان کے اب تک کے افسانوی سفر کا انتخاب کہا جاسکتا ہے۔

ایچ ایم یٰسین افسانوی دنیا کا غیر معروف سا نام ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ **'میں نے تو کہا تھا'** میں کل ۱۷/افسانے شامل ہیں۔ وہ خود ایک بڑے تعلیمی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں اور کافی عرصہ تک مختلف سرکاری دفتروں کے علاوہ ایک ائیر لائنس سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ افسانے معلوماتی زیادہ ہیں جو اکثر افسانے کم، حقیقت زیادہ نظر آتے ہیں۔

اپنے افسانوں میں انہوں نے ہوائی پروازوں کی کمپنیوں میں کام کرنے والے ملازمین کی زندگی سے تعلق رکھنے والے احساسات و مشکلات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے تکنیکی معاملات کو بھی شامل کرلیا ہے جس کی مثال اردو ادب میں کمیاب ہے۔ انداز بیان کبھی خطیبانہ بھی ہوا ہے لیکن اکثر معاملات اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش اس کے پس پردہ زیادہ ہے۔

اختر کاظمی کا افسانوی مجموعہ **'سراب زندگی'** اسی سال شائع ہوا ہے۔ جس میں ان کے ۲۰/افسانے شامل ہیں۔ تنہائی کا کرب، زندگی کی پیچیدگیاں، رشتوں کی باریکیاں، سماج میں رائج رسم و رواج کے پوشیدہ مسائل کے علاوہ سرکاری نظام کی خامیوں کا بخوبی ذکر ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں میں معمولی آدمی سے لے کر حکومت کے بڑے کارندوں تک شامل ہیں۔ ان کے اس مجموعے میں کہا گیا ہے کہ وہ ادب اس لئے نہیں تخلیق کررہے ہیں کہ انہیں ایک بڑا فنکار تصور کیا جائے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک سچے خادم ادب ہیں۔ ان کے پاس اپنی بات کہنے کا سلیقہ ہے اور افسانے کے فن سے کماحقہ واقفیت بھی ہے۔

ان کے افسانے 'کیا نام دوں' میں فرقہ واریت اور اس کے پس پردہ جہالت کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ 'لہو پکارے گا آستیں کا' ایسا احساس کراتا ہے کہ جیسے کسی فلم کا کوئی منظر۔ زبان تخلیقی ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ ہے۔

'کہرے کا چاند' نعیم کوثر کا افسانوی مجموعہ ہے۔ اسی سال شائع ہوا ہے، جس میں ۱۴/افسانے شامل ہیں۔ نعیم کوثر میں افسانہ نگاری کا فطری رنگ نظر آتا ہے۔ مختلف موضوعات کی ان کے ان افسانوں میں ذہنی کشمکش، حبس زدہ ماحول، مہنگائی، فسادات، خواہشات کے علاوہ دور جدید کی زندگی جس میں حقیقت کم نمائش زیادہ ہے، کا بڑے عمدہ ڈھنگ سے بیان ملتا ہے۔ انسان کس قدر لاچار و مجبور ہو چکا ہے، ان کے افسانوں میں مختلف مقامات پر نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے تجریدی رنگ لئے ہوئے بھی ہیں۔ اختصار میں کشادگی اور پیرائے اظہار میں جذبات کو نپے تلے الفاظ میں سجا دینا ان کا خاصہ کہا جاسکتا ہے۔ مدھیہ پردیش کی علاقائی موسیقیت اور ترنم کے ساتھ وہاں کی نغمگی کو بھی ان کے افسانوں میں محسوس کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔

● **سہیل وحید**

احمد حسنین جانوروں اور جنگل میں ان کے شکار کی حیرت انگیز کہانیوں کے خالق ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ **'شکار اور شکاری'** خاصہ دلچسپ اور جنگل کی پراسراریت سے بھرپور ہے۔ اس مجموعے میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں اور تقریباً سبھی کے عنوان جانور، شکاری اور جنگلات کے اسرار و رموز پر مبنی ہیں۔ مثلاً کالا ڈھونگی کا آدم خور شیر، تیج پور کا پاگل ہاتھی، آدھی رات کے پراسرار شکاری، لال کنویں کا آدم خور چیتا، دم کٹا بھیڑیا وغیرہ۔ شکاریات پر اردو میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ شاید اسی لئے اسے اردو میں اس موضوع پر باقاعدہ طور پر پہلی کتاب کہا جارہا ہے۔

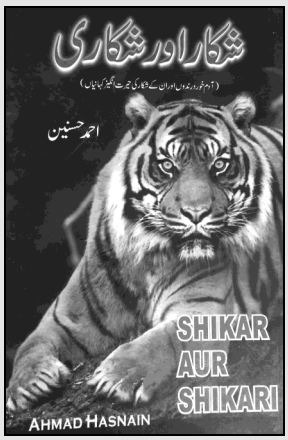

زیادہ تر کہانیاں ان کے اپنے تجربے اور مشاہدے کی عکاس ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں: 'ان کہانیوں میں جن قصوں کا بیان کیا گیا ہے وہ سب ان کے ذاتی تجربے ہیں اور اصلیت اور واقعیت پر مبنی ہیں۔ کہانیوں کے موڑ، شکار کے وقت، شکاری کی مجبوریاں اور جان جوکھم میں ڈال کر حالات سے نبرد آزما ہونے کی صورتیں اور پھر خطرات سے بچ نکلنے کی مشکلات اور ترکیبیں حیرت انگیز ہیں۔'

یہ کہانیاں محض قصہ نہیں بلکہ ان پر جو گزری ہے اس کا من و عن بیان ہے۔ کئی کہانیاں مثلاً دم کٹا بھیڑیا تو شاید بہتوں کو رات کو خواب میں پریشان بھی کرسکتی ہے۔ ایسے ماحول میں جب عشق و محبت، آپسی رشتوں کی نزاکت اور سیاسی چپقلش اردو افسانوں اور ناولوں کے پسندیدہ موضوعات بن چکے ہیں، 'شکار اور شکاری' اپنے انوکھے اور ڈراؤنے پن سے بہت متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے ان کہانیوں کے بہانے جنگلوں کی تباہی اور بربادی کا بھی بخوبی ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ماحولیات کے معاملے میں ہم خواہ مخواہ محض اپنے تجسس کے تحت قدرتی وسائل کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس سے قبل احمد حسنین کا ایک اور مجموعہ 'روشنی اور سائے' بھی شائع ہو چکا ہے جو خیالی واقعات پر مبنی تھا جب کہ یہ مجموعہ حقیقی واقعات پر۔ جنگل کے ہولناک واقعات اور درندگی کو انہوں نے جس خوش اسلوبی سے ادب کا حصہ بنا دیا ہے وہ انہیں کا خاصہ ہے۔

'نیادور' فروری ۲۰۱۸ء کے شمارے پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر حقانی القاسمی کا تبصرہ

پوری اردو دنیا میں 'نیا دور' کے نام سے معروف اس رسالے کا ایک خاص انداز رہا ہے اور اس نے ماضی میں جتنے بھی خصوصی شمارے شائع کئے ہیں ان کی دستاویزی اہمیت مسلم ہے۔ پہلے یہ رسالہ کتابت کے ذریعہ شائع ہوتا تھا مگر اب اس رسالے کی برقی کتابت ہوتی ہے۔ گزشتہ چند مہینوں میں سہیل وحید کی ادارت میں اس رسالے کا انداز بہت حد تک تبدیل ہوا ہے اور اس تبدیلی کو قارئین نے پسند بھی کیا ہے۔ اس کا تازہ شمارہ معاصر اردو شاعری کے دو اہم تخلیق کاروں سے متعلق ہے۔ ان میں ایک ندا فاضلی جیسے منفرد شاعر و ادیب ہیں جن کا 2016 میں انتقال ہوا تھا اور دوسرے بشیر بدر جیسے مقبول شاعر ہیں جو بستر علالت پر ہیں۔ ان دونوں اہم تخلیقی شخصیات سے منسوب اس رسالے میں بہت ہی اہم اور مقتدر شخصیات کی تحریریں ہیں۔ جن سے دونوں نابغہ فنکاروں کے فن اور شخصیت کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے۔ ندا فاضلی کے حوالے سے ان کی شریک حیات مالتی جوشی کا بہت ہی خوبصورت مضمون شامل ہے۔ جس میں انہو ں نے ندا فاضلی کے ساتھ اپنے گزرے ہوئے لمحوں کو سمیٹتے ہوئے ندا فاضلی سے ملاقات اور ان کی پسند و ناپسند کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ میرے آنے کے بعد انہوں نے دنیا داری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اپنے کام میں پوری طرح سے ڈوب گئے تھے۔ وہ کبھی کسی کے یہاں شادی یا پارٹی میں نہیں جاتے تھے۔ لکھنے کا ان کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ کبھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر، کبھی ٹی وی دیکھتے دیکھتے اچانک فون کر کے کسی پروڈیوسر یا میوزک ڈائریکٹر سے کہتے یہ نیا مکھڑا ہے یا نیا انترا اس میں ڈال سکتے ہیں۔ مالتی جوشی کے علاوہ سلام بن رزاق، عتیق اللہ، شکیل اعظمی، مظہر احمد، شاہنواز قریشی، حسن کاظمی، زیبا محمود، عائشہ ضیاء کی تحریریں بھی ندا فاضلی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے شامل ہیں۔ سلام بن رزاق نے ان کی نثری کتابوں 'ملاقاتیں، چہرے اور دیواروں کے بیچ' کے حوالے سے لکھا ہے جس کی قرأت سے پتہ چلتا ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری کی طرح ان کی نثر بھی لاجواب تھی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ندا فاضلی کی خودنوشت 'دیواروں کے بیچ' کا مربوط اور منطقی تجزیہ کرتے ہوئے سوانحی ناولوں میں دیواروں کے بیچ کے امتیازات کو واضح کیا ہے۔ اس سوانحی ناول کے حوالے سے یہ بہت اہم تحریر ہے۔ شکیل اعظمی نے ندا فاضلی سے اپنے تعلقات کی پوری کہانی لکھی ہے۔ یہ ایک اچھا تاثراتی مضمون ہے جس سے ندا فاضلی کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مظہر احمد نے ندا فاضلی کی نثر نگاری کی تفہیم کے حوالے سے ان کی خودنوشت 'دیواروں کے بیچ' پر مرکوز رہ کر ان کے مخصوص نثری اسلوب کی داد دی ہے۔ شاہنواز قریشی نے اپنے مضمون میں یہ واضح کیا ہے کہ ندا فاضلی نے شاعری میں ایک نئی زمین تلاش کی ہے اور وہ کسی اسلوب کے اسیر نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا ایک مخصوص لہجہ ہے اور اسی سے ان کی پہچان ہوتی ہے۔ ان کے اشعار ان کا نام لیے بغیر لکھ دیے جائیں تو اس کا لہجہ بتا دیتا ہے کہ یہ اشعار ندا فاضلی کے ہیں۔ حسن کاظمی نے بھی ندا فاضلی سے اپنے تعلقات کی داستان تحریر کی ہے اور ان کی شخصیت کے کئی اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ عائشہ ضیاء نے ندا فاضلی کی شاعری کے امتیازی پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی لفظیاتی و موضوعاتی انفرادیت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ندا لوک ادب ہندی کلاسیکی سرمائے کی روح اور اردو کی روایت کو ہم آمیز کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ اس میں ندا فاضلی کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے اور اس میں کچھ نثری تحریریں بھی ہیں۔ ندا فاضلی کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے جو سہیل وحید نے ان سے لیا تھا۔ جس میں ندا فاضلی نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ اردو ہندی دونوں زبانوں کا علاقہ ایک ہی ہے۔ امیر خسرو کے زمانے میں ہندی اور اردو کا جھگڑا ہی نہیں تھا۔

معروف اور مقبول شاعر بشیر بدر کے کے حوالے سے 'نیا دور' میں جو تحریریں شامل ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں۔ اس میں بشیر بدر کی شریک حیات محترمہ راحت بدر کا انٹرویو بھی شامل ہے۔ جس سے بشیر بدر کی شخصیت اور شاعری کے تعلق سے بہت اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ انٹرویو سہیل وحید نے لیا ہے۔ راحت بدر نے پنے انٹرویو میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ بشیر بدر محبت کے شاعر تو ہیں ہی اس کے علاوہ اپنی مٹی سے جڑے ہوئے شاعر ہیں۔ آسان زبان میں بڑے بڑے سے مضمون کو باندھنا اور عوام کے دل و دماغ میں بیٹھا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وسیم بریلوی نے بشیر بدر کے حوالے سے لکھتے ہوئے جہاں مشاعروں میں اپنی رفاقت اور تعلق کا ذکر کیا ہے وہیں اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ بشیر بدر کی غزل اس نمناک غنائیت کی سبک روی کا نام ہے جسے کوئی شعری عہد اپنے سفر کا عنوان بنانے میں فخر محسوس کرے گا۔ انہوں نے لفظ کی بیانیہ طاقت کی انتہاؤں کو حساس فکر کی انگلیوں سے کچھ ایسے چھوا اور ایسی شعری فضا بنائی کہ بشیر بدر کا گھور مخالف بھی دانتوں میں انگشت اعتراف دبائے بغیر نہیں رہتا۔ شاعر فتح پوری نے ان کی شاعری کا بہت عمدہ جائزہ لیا ہے۔ رضیہ حامد نے بشیر بدر کے انفرادی زاویہ نگاہ اور جدید طرز اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ بشیر بدر نے عام بول چال کی زبان کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے اور ان کے کلام میں نئی نئی تراکیب اور حسی تلازمے ہیں جن سے شعریت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اقبال مسعود نے بشیر بدر کی تخلیقیت کو اپنا مرکز بناتے ہوئے بڑی اہم بات کہی ہے کہ بشیر بدر نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندی اور اردو کے درمیان دوستی اور محبت کا ایسا پل تعمیر کیا جس نے غزل کو ایک طرف ہندوستانی بنا دیا تو دوسری طرف تتلی گلی سے نکل کر غزل اس شاہراہ پر رواں دواں ہوگئی جو ملک کے قومی دھارے سے وابستہ تھی اور ہمہ جہتی تہذیب کا عکس بن گئی۔ احمد محفوظ نے اکائی سے آمد تک ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں یہ تحریر کیا ہے کہ وہ اس لحاظ سے ممتاز کہے جاسکتے ہیں کہ ان کے کئی اشعار عوامی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مست حفیظ رحمانی نے بشیر بدر کے قیام سیتاپور کے حوالے سے معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ ریشما پروین نے بشیر بدر کی شاعری کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ان کے اکثر اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ نور فاطمہ نے بشیر بدر کی شاعری میں آفاقیت کے عناصر تلاش کئے ہیں۔ قارئین کے درمیان بشیر کی شاعری کی مقبولیت کا راز سادہ و سلیس زبان اور ان کی شاعری کے دھیمے لہجہ میں پوشیدہ ہے غالباً اسی سبب ان کے اشعار زبانزد ہو کر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اردو کے دو مقبول شاعروں ندا فاضلی اور بشیر بدر کو معنون نیا دور کا یہ شمارہ 96 صفحات پر محیط ہے اور دیدہ زیب کتابت و طباعت سے مزین ہے۔ اس بیش قیمت شمارے کی قیمت صرف 10 روپے ہے۔ سہیل وحید جیسے اختراعی ذہن رکھنے والے ادیب کی ادارت میں ''نیا دور'' حکومت اتر پردیش کا یہ ادبی و ثقافتی ترجمان ماہنامہ نیا دور شہرت اور مقبولیت کی نئی بلندیاں طے کرتا جا رہا ہے۔

❑❑❑

آپ کے خطوط

نیا دور یوں تو ہمیشہ ہی سے اپنی عمدہ نگارشات اور معیاری مضامین کی وجہ سے اردو کے معیاری وممتاز رسائل میں سرفہرست رہا ہے۔ اس کے خصوصی شمارے تو دستاویز کا مقام رکھتے ہیں۔ نئی ادارت کے زیر اہتمام اس کے اندر جو نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں، ان سے اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا ہے۔ فروری کے شمارے کی چکاچوندھ ابھی آنکھوں سے اوجھل بھی نہ ہو پائی تھی کہ مارچ کے شمارے نے آنکھوں کو مزید خیرہ کر دیا۔ ماڈرن آرٹ سے مزین سرورق اپنی دلکشی سے مسحور کر رہا تھا کہ پہلا ورق پلٹتے ہی قلمکار حضرات کے اسماء ومضامین نے دل کو مزید شادمانی عطا کر دی۔ دیکھتے ہی مطالعہ شروع کر دیا۔ پہلے ہی مضمون 'علم الانسان مالم یعلم' نے دل کو موہ لیا۔ اس کے بعد کے مضامین بھی کچھ ایسی ہی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔

مدیر محترم نے مضامین کو منتخب کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس میں وطن عزیز کی اہم جامعات کے تعلق سے خود ان کے فیض یافتگان کے رشحات قلم یکجا کر دئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ اس حوالے سے ایک خصوصی شمارہ بن گیا ہے۔ (اگر ہو سکے تو کسی شمارے میں ہمدرد یونیورسٹی کے حوالے سے بھی لکھوایئے۔ یہ بھی ہماری ایک عظیم دانش گاہ ہے۔)

زیر نظر شمارے میں شامل صالحہ صدیقی کا مضمون جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعارف پیش کرتا ہے۔ سید محمد عقیل اور سفینہ بیگم کی تحریر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یاد تازہ کراتی ہیں تو نور فاطمہ کے زرنگار قلم نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں گزارے لمحات کو اس قدر دلنشین و دلآویز انداز میں پیش کیا ہے کہ دل بیتاب ہوا ٹھا کہ ان کی طرزِ تحریر کی داد دی جائے۔ ثوبان سعید کے ذریعہ خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ کا ذکر۔

خیر، ان مضامین کے ذریعہ آپ نے ملک کی اہم یونیورسٹیوں کی سیر کرنے کا سامان فراہم کر دیا اور ہم ایک ہی نشست میں دہلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور حیدرآباد جیسے شہروں میں واقع جامعات کی تفریح کرنے کی سعادت حاصل کر سکے۔ پھر قلمکار حضرات کی سحر نگاری کے ہر ہر لمحہ یہی گمان ہوا کہ قاری بذات خود وہاں موجود ہے اور وہاں کے حسین وخوشنما مناظر سے براہ راست لطف اندوز ہو رہا ہے۔ ان مضامین کے ساتھ ہی ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، مرزا جعفر حسین، حمید دلوائی، طلعت گل اور نجیب انصاری کے رشحات قلم بھی اس چمن کی گل کاری میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ شاعری کے گوشے میں غزلیات کی شمولیت نے بادِ بہاری کا کام کیا ہے۔ خاص کر اصغر گونڈوی کی غزل 'رنج تھا اسیروں کو بال و پر کے جانے سے' دل کو چھو گئی۔ واقعی نیا دور کے جدید رنگ و ادب اور نئے اسلوب و آہنگ نے اس کے مقام و وقار کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا ہے۔ واقعی اس کے مضامین ومندرجات قاری کے ذہن و دل کو تابانیاں اور قلب و ذہن کو جولانیاں عطا کرتے ہیں۔ اس کے لئے جہاں اس کے جملہ اہل قلم حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ وہیں مدیر محترم اپنی تمام ٹیم کے ساتھ اس تحسین وستائش کے حقدار ہیں جو ان کا جائز وواجبی حق ہے۔

راقم الحروف آپ کے حضور تحسین وستائش اور امتنان وتشکر کے چند الفاظ پیش کرنا اپنا ذوق علمی اور فرض ادبی محسوس کر رہا ہے۔ اس لئے سطورِ ہذا آپ کے نذر کر رہا ہوں۔ 'گر قبول افتد زہے عز وشرف'

دعا ہے کہ اردو کی یہ شمع نورانی اپنی تجلیات اور جملہ رنگ و بو اس جہان علم و ادب پر اسی طرح ضوفشاں رہے اور ہم تشنگان ادب کو اس کی نورانیت سے اپنے اذہان وقلوب کو منور کرنے کی صلاحیت عطا ہوتی رہے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمن عاکف سنبھلی
ایم جی ایم (پی جی) کالج، سنبھل

مئی ۲۰۱۸ء کا نیا دور موصول ہوا۔ اردو ادب کے مایۂ ناز قلمکاروں من جملہ سلام بن رزاق، مرزا جعفر حسین وغیرہ کی تحریروں سے مزین۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ داؤد احمد نے اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور کافی حد تک معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو ادب میں مزید تحقیق کی ضرورت باقی ہے۔ زین الدین حیدر کا مضمون 'آغا حشر کاشمیری ملقب بہ انڈین شیکسپیئر، عظیم ڈرامہ نگار، اداکار اور شاعر' بھی کافی حیران کن ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی شخصیت کہیں گم سی ہو گئی ہے۔ جب ان میں اتنی خوبیاں تھیں کہ وہ بیک وقت ڈرامہ نگار، اداکار اور شاعر بھی تھے تو ان پر تحقیق کے لئے اداروں کو آگے آنا چاہئے اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کے علاوہ کچھ نئے نکات کو بھی ان کی نظم اور نثر نگاری سے اخذ کیا جا سکتا ہے تاکہ ان کی خصوصیات اور صلاحیتیں مزید واضح ہو سکیں۔ افسانوں کا حصہ مکمل طور پر متاثر کرتا ہے۔ سلام بن رزاق، تبسم فاطمہ، محمد قمر سلیم، عارف محمود، عبد الصبور قدوائی، گل جبین اختر وغیرہ کے افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بازدید اور گزشتہ لکھنؤ تو ایک نئی کھوج سی ہے۔ ساجدہ زیدی کی نظمیں کافی مشہور ہیں۔ رسالے میں شائع نظم 'فقیری میں' کافی عمدہ ہے اور غزلیں بھی بہتر ہیں لیکن غزل اور نظم انتخاب اس سے بہتر ہو سکتا تھا۔ رسالے میں شامل غزلیں بھی اچھی ہیں خاص کر مناظر حسن شاہین کی غزل بہترین لگی۔ باقی رسالہ بھی عمدہ ہے۔

تحسین مہدی
بارہ بنکی، یوپی

وزیراعظم جناب نریندر مودی لکھنؤ میں وزیراعظم رہائشی اسکیم، امرت اسکیم
اور اسمارٹ سٹی مشن کی تیسری سالگرہ کے موقع پر انعام سے نوازتے ہوئے (۲۸ر جولائی ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کارگل شہید اسمرتی واٹیکا لکھنؤ میں
کارگل وجئے دیوس کے موقع پر منعقد پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے (۲۶ر جولائی ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی ضلع ایٹہ میں
اسکول کے بچوں کو نصابی کتب اور اسکول بیگ تقسیم کرتے ہوئے (۲۳ر جولائی ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

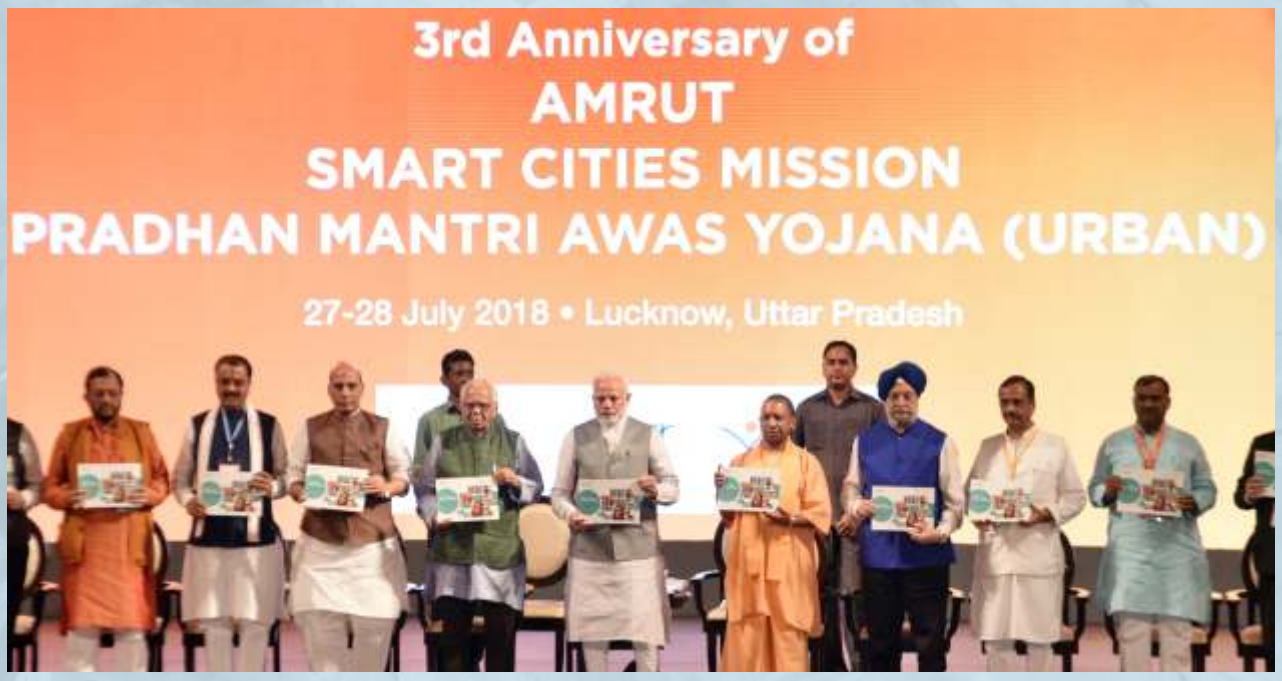

وزیراعظم جناب نریندر مودی لکھنؤ میں منعقد گراؤنڈ بریکنگ سرمنی میں وزیراعظم رہائشی اسکیم، امرت اسکیم
اور اسمارٹ سٹی مشن کی تیسری سالگرہ پر ترقیاتی کاموں کی تفصیل کے سلسلہ میں شائع کتاب کا اجراء کرتے ہوئے (۲۸/جولائی ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک کی صدارت میں راج بھون، لکھنؤ میں منعقد
رام پور رضا لائبریری کی ۴۸ ویں میٹنگ میں نیوز لیٹر کے ایک مجموعہ کا اجراء کیا گیا (۱۷/جولائی ۲۰۱۸ء)

نیا دور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے بھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

वर्ष : 73 अंक 03
जूलाई 2018
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 165 रु./–

प्रकाशक व मुद्रक, डॉ0 उज्ज्वल कुमार, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सुहेल वहीद**